ننھا سیاح

CALGARY PUBLIC LIBRARY
3 9065 03979 1403
CHILDREN
&
YOUNG ADULTS

ننّھا سیّاح

ناول

عجیب و غریب جزیرے میں ایک ننّھے سیّاح
کے سفر کے حیرت انگیز واقعات

محمد زکریا مائل

Nanha Saiyah
Rs 7P2

مکتبہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

مجلسِ ادارت

حکیم محمد سعید

مسعود احمد برکاتی

احمد خاں خلیل

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلا ہندستانی اڈیشن: جولائی ۱۹۸۹ء تعداد 1000 قیمت: ۷/-

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلّی میں طبع ہوئی

ننھا سیاح

ایک ننھا مسافر، ایک حیرت انگیز سفر، ایک سرسبز و شاداب جزیرہ

ایک شہزادی، اُس کا مصاحب اور اُن کی انوکھی باتیں

ننھے مسافر کی زر و جواہر کے ساتھ وطن کو واپسی

بچوں کے لیے ایک دل چسپ اور عجیب و غریب ناول

بغداد کا نام کس نے نہیں سنا؟ یہ شہر آج بھی موجود ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں ملک عراق کا بادشاہ بھی رہتا تھا ـــــ ایک زمانے میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور لوگ اس کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کا حال ہے جب بغداد پر عباسی خاندان کے خلفا کی حکومت تھی۔ ہاں تو یہ بغداد ان دنوں بڑی شان و شوکت اور رونق کا شہر تھا۔ اس میں لاکھوں آدمی آباد تھے۔ دنیا کے ہر حصے سے تاجر اور سوداگر یہاں آیا کرتے اور خوب دولت کماتے۔ اسی طرح اس شہر میں

ہندستان اور چین جیسے دور دراز ملکوں کے طالب علموں کی بھی بڑی ریل پیل تھی جو یہاں آکر طرح طرح کے علم اور ہنر سیکھا کرتے۔ غرض اس زمانے کا بغداد رونق، آبادی، خوش نمائی اور علم و فن کی شہرت میں دنیا بھر کی سلطنتوں کی ناک بنا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی اس زبردست سلطنت کی مثال دنیا کے کسی اور مقام پر نہ ملتی تھی اور نہ بغداد کا ایسا بارونق شہر کہیں دیکھنے میں آتا تھا۔

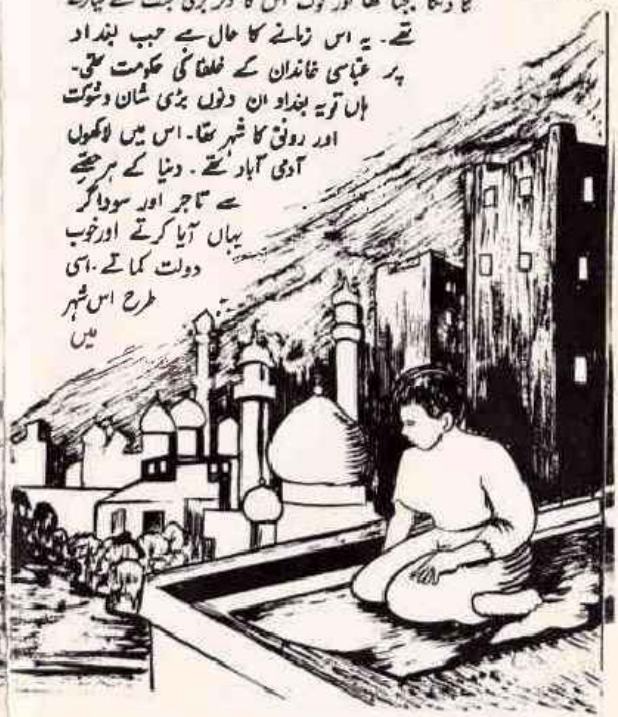

بغداد کے اونچے اونچے شان دار محل دریائے دجلہ کے دونوں جانب مشرق اور مغرب میں کھڑے اپنی بہار دکھاتے رہتے تھے۔ رات کو ان کی روشنی کا عکس دریا میں پڑتا تو عجیب تماشا سا نظر آتا اور دیکھنے والے پہروں اس سہرے سماں سے لطف اٹھاتے۔ روشنیوں کے علاوہ انھی محلوں سے طرح طرح کے مزے دار گانوں اور گیتوں کی آوازیں بھی پھوٹتیں اور ہوا کے ذریعے امیروں کی اس آبادی سے دور فقیروں، مسکینوں اور غریبوں کے جھونپڑوں تک پہنچتیں اور وہ بھی ان آوازوں سے کچھ نہ کچھ اپنا دل بہلا لیا کرتے تھے۔

نجم الدین ایک یتیم لڑکا تھا۔ یہ بچہ ہی تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کی ماں نے ہمیشہ کے لیے دنیا سے منہ موڑا اور اسے اپنی بہن کے سپرد کرکے خدا کے

گھر سدھاری۔ اب نجم الدین اپنی بوڑھی اور غریب خالہ کے ہاں رہنے لگا۔ جو غریبوں کے محلے میں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

نجم الدین جسے پیار سے اس کے ماں باپ نجی کہا کرتے تھے، جب رات کو سونے کے لیے تکیے پر سر رکھتا تو اسے دور سے نظر آنے والے محلوں کی روشنیاں بہت بھلی لگتیں۔ ساتھ ہی اس کے کانوں میں ان کے گانے گونجا کرتے اور اکثر اس کا خیال ان محلوں میں جا پہنچتا۔ وہ دل ہی دل میں امیروں کی عیش و آرام سے بھری زندگی اور ان کے شان و شوکت سے رہنے سجنے کے طریقوں کا تصور کرتا رہتا۔ اس حال میں اکثر اسے ماں باپ کی امیری اور خوش حالی کے قصے بھی یاد آیا کرتے جو اس کی خالہ اسے آئے دن سنایا کرتی تھیں

پھر وہ اپنی موجودہ حالت کو سوچنے لگتا۔ اپنے باپ کو یاد کرتا جسے اس نے دیکھا تک نہ تھا۔ اسے اپنی خالہ کا یہ کہنا یاد آتا کہ "تمھارے باپ نے جو مال اور بہت سی دولت چھوڑی تھی، وہ سب جاتی رہی۔ تمھارا باپ سوداگری کے لیے ہندستان گیا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے بیمار ہو کر وہیں مر گیا اور سوداگری کا سارا مال تباہ ہو گیا۔ بغداد میں اس کی جتنی جائیداد اور دولت تھی، اس پر قرض داروں نے قبضہ کر لیا۔ تمھاری ماں اور تمھارے لیے سوائے اس چھوٹے سے گھر کے کچھ نہ بچا۔"

نجم الدین کی ماں جب تک زندہ رہی، اپنے لڑکے کو پالنے اور سکھانے پڑھانے کی کوشش کرتی رہی، مگر وہ بیچاری شوہر کے مرنے کے بعد دو برس سے زیادہ زندہ نہ رہی۔ اس کے بعد خالہ کے سوا نجی کا کوئی سہارا نہ رہا۔

تھوڑے دنوں تک تو نجی پڑھتا لکھتا رہا، لیکن جب بوڑھی خالہ کو روپے پیسے سے بہت تنگ پایا تو مجبور ہو کر مدرسہ چھوڑا اور کسی ایسے کام کی فکر میں پڑ گیا جس کے کرنے سے چار پیسے ہاتھ آئیں۔ اور اس کی اور خالہ کی روٹی چل سکے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی پیشہ نہ جانتا تھا اور اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ لوگ اسے بازاروں یا کھیتوں میں مزدوروں اور معمولی نوکروں کی طرح کام کرتے دیکھیں، اس لیے کہ وہ بڑے گھر کا لڑکا مشہور تھا۔

بڑی مشکل سے اسے لے دے کر ایک کام ملا جس سے بہت تھوڑی مزدوری ہاتھ آجاتی۔ اسے کتابوں کے ایک چالاک سوداگر نے کتابیں نقل کرنے کے کام پر رکھ لیا۔ نجی روز صبح کو سوداگر کے ہاں جاتا اور دن بھر بیٹھا کتابیں نقل کیا کرتا۔ اس زمانے میں چھاپے خانے تو تھے نہیں، کتابوں کی تجارت اسی طرح ہوتی تھی۔ جہاں کوئی کتاب ملی اس کی نقلیں کرالی جاتیں اور انھی کو لوگوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا۔ مگر دن بھر کی اس مشقت کا بدلہ نجی کو کیا ملتا۔ صرف دو درہم۔ انھی دو درہموں

سے وہ جتنا کھانا میسر آتا، خرید لیتا اور وہ اور اس کی خالہ صبر و شکر کے ساتھ کھا لیا کرتیں۔

بیچارہ نجم الدین اس تنگی کی زندگی سے گھبرا گیا تھا۔ جب تھکا ہارا گھر آتا اور کھا پی کر سونے کو لیٹتا تو اسے چمکتے ہوئے ستاروں اور سامنے والے محلوں کی روشنیوں میں ایسا محسوس ہوتا جیسے بدنصیبی اس کے دل پہ ڈیرا جمائے ہوئے ہے۔ ایسے موقعوں پر اسے بارہا خیال آیا کہ روزی کی تلاش میں بغداد کو چھوڑ کر کسی اور جگہ چلا جائے۔ مگر پھر اس سوچ میں پڑ جاتا کہ جائے تو کہاں جائے؟

کتنی ہی مرتبہ اس کے جی میں آئی کہ اپنے باپ کے دوستوں اور عزیزوں کے پاس جائے، تاکہ وہ اس کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھائیں، مگر پھر وہ فوراً ہی اس خیال کو دل سے نکال دیتا، کیوں کہ وہ اپنی خالہ سے ایسی باتیں بارہا سن چکا تھا جن کی وجہ سے اسے ان خود غرض عزیزوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور وہ ان سے دور ہی رہنا اچھا سمجھتا تھا۔

اگرچہ یہ پریشانیاں نجمی کو اداس بنائے رکھتی تھیں، پھر بھی اسے پڑھنے لکھنے سے دلچسپی رہتی تھی۔ اتفاق کی بات کہ کام ایسا ملا تھا جس سے اس کی معلومات چپکے ہی چپکے بڑھتی رہتیں۔ کتابیں نقل کرنے میں اسے شاعروں اور ادیبوں کے حالات معلوم ہوتے اور وہ یہ پڑھتا کہ بڑے بڑے امیر اور خلیفہ اور بادشاہ شاعروں کو کیسے کیسے انعام اور خلعت وغیرہ دیا کرتے تھے اور ان لوگوں کی کس کس طرح عزت اور خاطر تواضع کی جاتی تھی۔ یہ حالات اور قصے پڑھ پڑھ کر نجمی کا دل بڑھتا اور چوں کہ اس کو شعر و شاعری سے قدرتی لگاؤ تھا، اس لیے اس کے جی میں آتی کہ وہ بھی ایک قصیدہ لکھے۔

اسی طرح سوچتے سوچتے اس نے بغداد کے ایک بڑے امیر کی تعریف میں قصیدہ لکھنا شروع کر دیا جس کا نام تھا "قیسون"۔ اس امیر کا محل

بڑا شان دار تھا اور دریا کے دوسرے کنارے پر اپنی بہار دکھاتا رہتا تھا۔ کوئی ایک ہفتے میں پچاس شعروں کا قصیدہ تیار ہوا۔ اس نے یہ قصیدہ ایک ستھرے کاغذ پر بڑے اچھے خط میں لکھا اور اسے بڑے سلیقے سے لپیٹ کر رکھا، تاکہ دوسرے دن صبح کو اسے لے کر امیر کے ہاں پہنچے۔ اس رات نجمی کو بڑی خوشی تھی اور امیدیں رہ رہ کر دل میں مچل رہی تھیں، اسی لیے نیند بھی اچھی طرح نہ آئی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور وہ سویرے ہی منہ ہاتھ دھوتے اور نماز پڑھنے کے بعد دریا کی طرف چل کھڑا ہوا، تاکہ کشتی میں بیٹھ کر دوسرے کنارے پر "قیسون" کے ہاں حاضری دے۔

دریا پہ شیخ عبد السلام کی کشتی مسافروں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ شیخ کا دل بڑا نیک اور ہمدرد تھا۔ یہ نجمی کو مزدوری لیے بغیر اس پار پہنچا دیا کرتا تھا۔ اس نے نجمی کو دیکھا تو علیک سلیک کے بعد اس کا حال اور خیریت دریافت کی، پھر کشتی میں بٹھا کر اس پار کر دیا۔

نجمی خوش خوش امیر قیسون کے محل کی طرف بڑھا، مگر جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا، محل کا ایک ڈراؤنی شکل کا نوکر ہاتھ میں کوڑا لیے ہوئے لپکا اور نجمی کو ڈانٹ کر کہا، "کہاں جاتا ہے او لڑکے؟"

"عالی جناب، امیر قیسون کے گھر۔" نجمی نے ادب سے جواب دیا

اس آدمی نے نجمی کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر اس سے پوچھا

"اور تم امیر سے چاہتے کیا ہو؟"

اس وقت نجم الدین سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔ قصیدہ اس کی جیب میں تھا۔ اسے نکالا اور اس آدمی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "میں چاہتا ہوں کہ ....."

مشٹنڈے نوکر نے اسے اپنی بات بھی پوری نہ کرنے دی۔ ایک مرتبہ پھر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور زور سے ایک قہقہہ لگایا۔

یہ دیکھ کر نجمی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ اس کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ اس کی آنکھوں

میں آنسو بھر آئے اور وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا واپس ہوا۔ اس وقت وہ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ راستے میں کئی گڑھے ملے جن سے اس نے ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔

اسی حال میں اسے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ اس نے پل کے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ شیخ عبدالسلام ہے۔ پاس گیا تو شیخ نے اپنے ہاتھ سے اس کے

آنسو پونچھے۔ بخی کو اس حال میں پاکر شیخ کا دل بھر آیا اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا، "کیا بیٹا اس بار چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

بخی سے کوئی جواب نہ بنا۔ صرف اتنا کہا:

"چچا جان، آپ کا شکریہ!"

کشتی اس وقت خالی کھڑی تھی۔ بخی اس میں اتر کر شیخ کے قریب بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے بیٹا آج تم بہت غمگین نظر آتے ہو؟" شیخ نے پوچھا

بخی کا دل تو بھرا ہی تھا۔ یہ پوچھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شیخ نے تسلی دی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر رونے کا سبب پوچھا، مگر بخی کے آنسو نہ تھمتے تھے اس لیے کچھ نہ کہہ سکا۔

شیخ نے لوٹا لے کر بخی کا منہ دھلایا۔ اسے تھوڑا پانی پلایا، پھر تھیلی میں سے تھوڑی کھجوریں نکال کر بخی کو دیں جو اس نے شکریہ ادا کر کے لے لیں اور کھانے لگا۔ اب اسے ایسا معلوم ہوا جیسے شیخ کی تسلی اور دلاسے سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔

جب شیخ نے دیکھا کہ اب بخی کی طبیعت سنبھل گئی ہے تو اس نے کہا، "اتنا غم کیوں کرتے ہو بیٹا؟ ابھی تو تم چھوٹے ہی ہو؟"

اب بخی میں بات کرنے کی ہمت پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے جواب دیا:

"میں بغداد بھر میں سب سے زیادہ بدنصیب ہوں چچا جان!"

اس کے بعد بخی نے اپنی پریشانیاں اور الجھنیں بیان کرنا شروع کیں اور آخر میں قصیدہ لکھنے اور قصیدوں کے ذکر کے ہاتھوں ذلت اٹھانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔

شیخ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا، "بیٹا، تم کم عمر لڑکے ہو، ماشاءاللہ ہاتھ پاؤں کے مضبوط ہو، کچھ محتاج اور اپاہج تو ہو نہیں جو اتنا گھبراتے ہو۔ ہاں ذرا تم سے چوک ہو گئی۔ بیٹا، امیروں کے لیے قصیدے لکھنا صرف ہمت کے ہیٹوں اور گھٹیا درجے کے لوگوں کا کام ہے۔ وہی ان کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں اور جیسے کتا ہڈی کے پیچھے دوڑتا اور دم ہلاتا ہے، یہ امیروں کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔

"مگر چچا جان، مجھ سے تو صرف مایوسی میں یہ حرکت ہو گئی" نجم الدین جھینپ کر بولا۔ شیخ نے محبت بھری نظریں ڈال کر کہا، "بیٹا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ ہے۔ ہم مسلمانوں کا یہ طریقہ نہیں، آؤ تم میرے ساتھ کام کیا کرو۔ مجھے تم جیسے لڑکوں کی بہت ضرورت ہے۔"

نجمی تھوڑی دیر چپ رہا تو شیخ اس کے دل کی بات سمجھ گیا اور کہا:

"جو لوگ گاڑھے پسینے کی کمائی کھاتے ہیں، ان کے لیے کسی بات میں شرم نہیں۔"

شیخ کی یہ بات نجمی کے دل میں اتر گئی اور اس نے خوش ہو کر کہا: "چچا جان، آپ کی اس نصیحت کا بہت شکریہ، مگر مجھے یہ کام تو آتا ہی نہیں۔ میں آپ کی مدد کیسے کروں گا؟"

"تم اس کی فکر نہ کرو" شیخ نے کہا، "میں تمھیں بہت جلد سکھا دوں گا۔

اس کے لیے زیادہ مدت کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

اتنے میں کچھ مسافر کشتی کے پاس جمع ہو گئے۔ شیخ نے نجمی سے کہا:

"تم پتوار پہ بیٹھ جاؤ اور جیسے میں کہوں دائیں یا بائیں طرف اپنا ہاتھ ہلاؤ۔ اس طرح تیرے لیے کشتی کھینا آسان ہو جائے گا۔"

نجمی نے نیک دل شیخ کے ساتھ اسی وقت سے کام کرنا شروع کر دیا۔

جب اس نے دیکھا کہ لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تو اسے اطمینان ہوا۔ پھر جب وہ شام کو گھر جانے لگا تو شیخ نے اس کے حصّے کے پانچ درہم دیے جن سے اس نے روٹی، مچھلی اور کھجوریں خریدیں اور یہ سامان لیے ہوئے خوش خوش گھر پہنچا۔

آج نجمی خالہ کے ساتھ کھا پی کر بہت خوش تھا۔ جب سونے لگا اور اس کی نگاہیں نہر کے پانی پر پڑیں جس میں روشنی کا عکس خوب چمک رہا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی بڑے مزے کی چیز ہے جس میں آدمی کو آرام بھی ملتا ہے۔

حاجی سُلیمان

اپنے کام سے نجمی کی محبت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ وہ صبح سویرے نماز سے فرصت پا کر دریا پر چلا جاتا تاکہ کشتی کو دھوئے اور صاف کر کے اس کے چاروں طرف نارنگی اور زیتون کے پتّے اور پھولوں کی چھڑیاں لٹکائے۔ اس موقع پر جب سورج کی کرنیں دریا کی سطح کو ڈھانپ لیتیں اور دجلہ کا پانی تیزی سے اچھل اچھل کر بہتا تو نجمی اس تماشے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔

نجمی اپنا کام ایسے سلیقے اور تمیز کے ساتھ کیا کرتا تھا کہ بغداد کے لوگ دوسری کشتیوں کو چھوڑ کر اسی کشتی میں بڑے شوق سے دریا کو عبور کیا کرتے تھے اور اس طرح نجمی اور شیخ عبدالسلام کی آمدنی روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔

ایک دن نجم الدین اپنی عادت کے مطابق کشتی پر بہت سویرے جا پہنچا۔ اس زمانہ

میں گرمی کا موسم ختم ہونے کے قریب تھا۔ مشرق کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا کہ اتنے میں کسی کی آواز کان میں آئی۔

"السلام علیکم میاں نجم الدین!"

نجمی آواز سے پہچان گیا کہ یہ حاجی سلیمان ہیں۔ مسکراتا ہوا ان کی طرف مڑا اور کہا:

"وعلیکم السلام حاجی سلیمان صاحب"

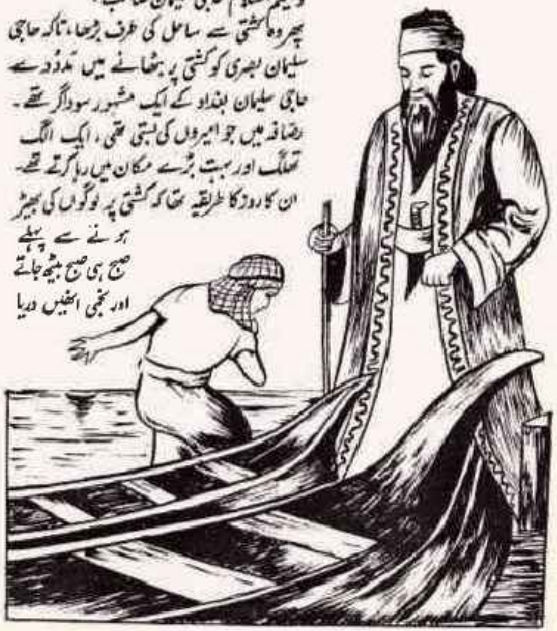

پھر وہ کشتی سے ساحل کی طرف بڑھا، تاکہ حاجی سلیمان بصری کو کشتی پر بٹھانے میں مدد دے۔

حاجی سلیمان بغداد کے ایک مشہور سوداگر تھے۔ رصافہ میں جو امیروں کی بستی تھی، ایک الگ تھلگ اور بہت بڑے مکان میں رہا کرتے تھے۔ ان کا روز کا طریقہ تھا کہ کشتی پر لوگوں کی بھیڑ ہونے سے پہلے صبح ہی صبح بیٹھ جاتے اور نجمی انھیں دریا

کے اس پار پہنچا دیا کرتا تھا۔

اس وقت کشتی میں تنہائی ہوتی اور حاجی کو نجمی سے باتیں کرنے کا موقع مل جاتا۔ انھوں نے تھوڑے ہی دنوں کے رکھ رکھاؤ اور بات چیت سے اندازہ کر لیا تھا کہ نجمی بڑا تمیزدار، عقل مند، شریف اور ہمت والا لڑکا ہے۔ آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ نجمی حاجی جی کی بہت عزت کرتا اور بعض وقت "چچا جان" کہہ کر بات کرتا۔ حاجی جی بھی اس بات سے خوش ہوتے اور اسے "بیٹا" کہا کرتے۔

جب کشتی دوسرے کنارے پر پہنچی تو حاجی سلیمان اترے۔ ان کے پاس ایک صندوقچہ ایک رومال میں لپٹا ہوا بڑا سا پلندہ اور ایک کتاب تھی جو زربفت کے ایک قیمتی جزدان میں رکھی ہوئی تھی۔ حاجی جی نے نجمی سے کہا:

"میاں نجمی ذرا میرے واپس آنے تک ان چیزوں کو اپنے پاس حفاظت سے رکھے رہنا۔"

نجمی نے سر جھکا کر یہ چیزیں لے لیں اور کشتی میں پچھلی نشست کے نیچے جو صندوق لوگوں کی امانتوں کے لیے رکھا ہوا تھا، اس میں احتیاط سے رکھ دیں۔ اس کے بعد حاجی اور نجمی دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ اتنے میں سورج اونچا ہو گیا اور کشتی پر مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔ نجمی ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بھری کشتی لے کر اس پار روانہ ہو کہ اس نے حاجی سلیمان کے پکارنے کی آواز سنی۔

نجمی اتر کر حاجی کے پاس گیا تو دیکھا ان کے چہرے سے فکر اور پریشانی ظاہر ہو رہی ہے اور وہ کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آ رہے ہیں۔

حاجی جی نے نجمی سے کہا، "مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے میاں نجم الدین"

نجمی نے ایک بار اُن کی طرف دیکھا پھر ایک بار کشتی کی طرف مڑا۔ لوگ اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ حاجی جی نے نجمی کی الجھن کو سمجھ لیا اور اس سے کہا، "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم ان لوگوں کو اس پار پہنچا کر میرے پاس پھر چلے آؤ؟"

نجم الدین نے کہا، "میں ابھی شیخ عبدالسلام کے گھر جاتا ہوں، تاکہ انھیں اپنی جگہ کام کرنے کے لیے بلا لاؤں، پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

حاجی سلیمان نے خوش ہو کر دعا دی اور کہا، "اچھا بیٹا، ایسا ہی کرو۔"

نجمی جلدی سے کشتی پر گیا اور اسے کھیتا ہوا اس پار لے گیا۔ خوش قسمتی سے دوسرے کنارے پر شیخ عبد السلام بھی اس وقت موجود تھے۔ نجمی نے کشتی ان کے حوالے کی، پھر اسی پر دوبارہ مغربی کنارے پر پہنچا، جہاں حاجی سلیمان کھڑے بے چینی سے نجمی کا انتظار کر رہے تھے۔

حاجی سلیمان نے کہا، "میاں، وہ سب چیزیں احتیاط سے لے کر اترآؤ اور ذرا میرے ساتھ چلو۔"

نجمی نے حاجی کے کہنے پر عمل کیا اور ان کے ساتھ چلنے لگا جو اس وقت ذرا تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے۔ نجمی کو تعجب تھا اور بار بار اپنے دل سے پوچھتا تھا کہ حاجی صاحب آخر مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہیں اور مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟

یہی سوچتے سوچتے وہ حاجی جی کے ساتھ ایک بہت بڑے مکان کے پاس پہنچا جو بیچ شہر میں تھا۔ حاجی سلیمان نے دروازہ کھولا اور خاموشی کے ساتھ نجمی کو لیے اس گھر میں داخل ہو گئے۔

پہلے ایک بڑا وسیع صحن ملا جس میں طرح طرح کے درخت لگے ہوئے تھے اور ان کے پتّوں سے زمین ڈھکی پڑی تھی۔ اس سے گزرنے کے بعد دونوں ایک بارہ دری میں پہنچے۔ حاجی جی نے نجمی کو اشارہ کیا کہ وہ چیزیں آبنوس کی میز پر رکھ دے پھر ایک تخت پر بیٹھ کر نجم الدین کو بھی بٹھایا اور اس سے کہا:

"مجھے پورا یقین ہے کہ تم اس وقت بہت حیران ہو گئے اور واقعی یہ ہے بھی تعجب کی بات۔"

نجمی نے کہا، "معاف فرمائیے جناب، آپ کا فرمانا بالکل درست ہے۔"

حاجی سلیمان نے کہا، "معافی مانگنے کی ضرورت نہیں اور تم تو جب میری باتیں سنو گے تو اور زیادہ تعجب کرو گے۔ بات یہ ہے کہ میں ادھر تین ہفتوں سے تم سے جو بات چیت کرتا رہا تھا، اس سے مجھے تمھاری شریفانہ عادتوں کا اندازہ ہوا۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم ایک دین دار اور اچھے گھرانے کے نیک لڑکے

ہو اس لیے مجھے تم سے محبت ہو گئی۔ خیر! اب میں بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا۔ تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں تم سے کس قسم کی مدد کا خواہش مند ہوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

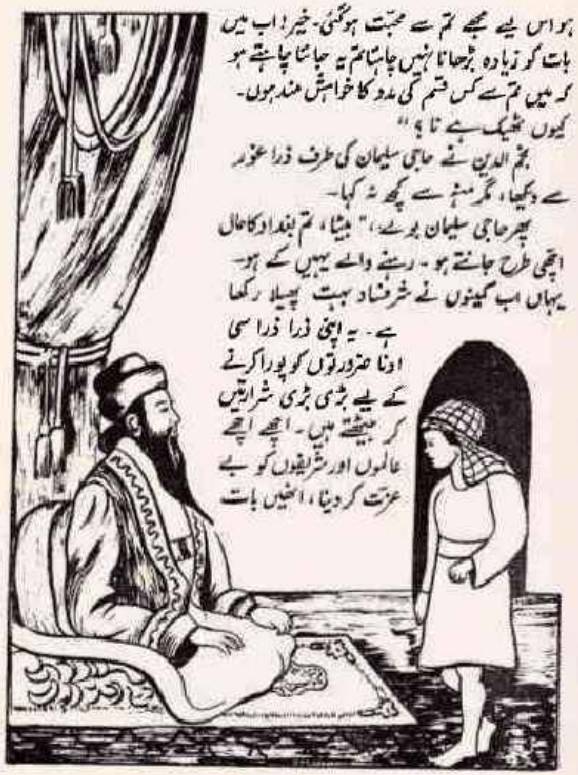

نجم الدین نے حاجی سلیمان کی طرف ذرا غور سے دیکھا، مگر منھ سے کچھ نہ کہا۔

پھر حاجی سلیمان بولے، "بیٹا، تم بغداد کا حال اچھی طرح جانتے ہو۔ رہنے والے یہیں کے ہو۔ یہاں اب کمینوں نے شر فساد بہت پھیلا رکھا ہے۔ یہ اپنی ذرا ذرا سی ادنا ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی شرارتیں کر بیٹھتے ہیں۔ اچھے اچھے عالموں اور شریفوں کو بے عزت کر دینا، انھیں بات

بات پر ستانا اور دکھ دینا، ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا ہے۔ جب دیکھو ان کی اسی قسم کی حرکتیں لوگوں کا ناک میں دم کیے رہتی ہیں۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ اب ایک نیا فتنہ اٹھانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ ایک مقررہ تاریخ پر خوب لوٹ مار مچائیں، لوگوں کی جانیں لیں، گھروں میں آگ لگائیں اور شریفوں کو ذلیل کریں۔ جانتے ہو، یہ سب حرکتیں وہ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ یہاں کا نیک اور باخدا وزیر شریف الدین ان کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ انھیں من مانی نہیں کرنے دیتا اس لیے یہ چاہتے ہیں کہ اسے جان سے مار ڈالیں۔" حاجی سلیمان نے اتنا کہہ کر نجم الدین کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ سر جھکائے ہوئے سن رہا تھا۔ اور اس سے کہا:

"تم اپنے جی میں کہو گے، ان سب باتوں سے تمھیں کیا مطلب؟ خوشی کی بات ہے کہ تم ان رنج و غم بڑھانے والی باتوں سے بہت دور ہو۔ تمھیں لے دے کے اپنی کشتی اور دریا سے کام ہے اور کسی چیز سے واسطہ نہیں، لیکن بدنصیبی سے میں اس وزیر کا دوست ہوں۔ اگر یہاں رہا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بدمعاش مجھے ہرگز جیتا نہ چھوڑیں گے، اس لیے میں نے جی میں ٹھان لی ہے کہ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ بغداد، بغداد والوں کو مبارک رہے۔"

"یہ سن کر نجمی بولا "مگر چچا جان، یہ خبر تو آپ نے اچھی نہیں سنائی۔ اب تو ہمیں آپ کی جدائی کھل جائے گی۔"

"بیٹا، میں ایک بہت دور دراز مقام پر چلا جاؤں گا۔" حاجی نے کہا، "جہاں جانے کا مجھے بے حد شوق ہے۔ شاید تمھیں معلوم نہیں، میں شفیق بصری نامی جوہری کی اولاد میں سے ہوں۔"

"کیا وہ سیاح شفیق بصری؟" نجمی نے کہا

"ہاں بیٹا وہی۔ وہ پانچویں پشت میں میرے دادا تھے۔" حاجی نے جواب دیا۔

پھر حاجی سلیمان نے ریشمی زر بفت کے جزدان میں سے کتاب نکالی اور نجم الدین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "یہ وہ کتاب ہے جس پر اس سے پہلے میرے سوا کسی کی

نظر نہیں پڑی۔"

نجمی نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے جلدی سے کہا، "جی ہاں میں نے ان کے بعض قصے پڑھے ہیں۔ جن میں انھوں نے دھوئیں کے پہاڑ اور کوہ قاف کی سیاحت اور سفر کے حالات بیان کیے ہیں۔"

"لیکن یہ ایک دوسرے سفر کا قصہ ہے۔" حاجی نے کہا، "یہ سفر انھوں نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کیا تھا اور اس کے حالات کسی سے بیان نہیں کیے۔"

نجم الدین نے کتاب کھولی اور پڑھتے ہی ایک جوش کی سی حالت میں کہا، "کتنا پیارا خط ہے اس کتاب کا!"

"ہاں بیٹا، یہ انھی کا خط ہے۔ انھیں اس کا بے حد خیال رہتا تھا کہ یہ قصہ

ایک چھپے ہوئے بھید کی طرح محفوظ رہے۔ سچ پوچھو تو مجھے اپنے باپ سے جو کچھ وراثت میں ملا ہے، یہ کتاب اس مال میں سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہمارے خاندان میں یہ ہوتا آیا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو یہ کتاب سپرد کرتے وقت وصیت کر دیا کرتا ہے کہ اس بھید کو اپنے بیٹوں سے چھپائے رکھنا، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی ایسا شخص اس سرزمین میں جا پہنچے جو اس کا حق دار نہ ہو۔"

"اور یہ سرزمین ہے کہاں چچا جان؟" نجم الدین نے پوچھا۔

حاجی سلیمان نے کہا، "دادا جان نے اس کا نام جزیرۂ سلیمان لکھا ہے۔ یہ سراندیپ سے تین دن کے راستے پر واقع ہے۔"

نجمی: پھر تو وہ قریب ہی ہے۔

حاجی: لیکن تعجب تو اسی کا ہے کہ پھر بھی لوگ وہاں نہیں جاتے، میں نے کسی مسافر و سیاح سے کبھی اس کا کوئی ذکر نہیں سنا۔

نجمی: تو پھر آپ کے دادا جان کیسے گئے؟

حاجی: بات یہ تھی کہ میرے دادا بڑے نڈر تھے۔ سمندر کے سفر سے کبھی نہ ڈرتے۔ یہ جزیرہ بیچ سمندر میں ہے۔ جہاز والے عام طور سے وہاں جانے کی ہمت نہیں کرتے اور وہی راستا اختیار کرتے ہیں جو کناروں کے قریب ہوتا ہے۔ انھیں دریائی غولوں اور ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا ہے۔

"تو کیا آپ کا ارادہ ہے وہاں جانے کا؟" نجمی نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، میں نے تو پکا ارادہ کر لیا ہے، پھر اب بغداد میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو مجھے روک سکے۔" حاجی نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر سر جھکائے رکھنے کے بعد غم بھری آواز میں بولے، "میرے کوئی بیٹا ہے نہیں۔ بیوی دو برس ہوئے اللہ کے ہاں جا پہنچیں۔ اب جو تمھارا حال ہے، نجم الدین! وہی میرا ہے۔ ہم دونوں اس بغداد میں اکیلے ہیں۔"

نجمی کو اس شخص پر بڑا ترس آیا جس کا دل ناامیدی سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا، "تو کیا چچا جان، مجھ سے آپ کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے؟"

حاجی سلیمان نے کہا، "بیٹا، مجھے تمھیں جیسے ہونہار لڑکے کی ضرورت ہے جو اس سفر میں میرا ساتھی بنے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ مجھے رات دن جزیرۂ سلیمان ہی کا دھیان رہا کرتا ہے۔"

پھر حاجی نے اس بات کا اثر معلوم کرنے کے لیے نجمی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نجمی نے دونوں آنکھیں کھول دیں اور ایسی آواز سے بولا جیسے خواب میں ہو۔ "جزیرۂ سلیمان!"

حاجی نے نجمی پر نظریں جماتے ہوئے کہا، "نجم الدین، بغداد میں تم بھی میری طرح اکیلے ہو۔ تمھارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ذرا سوچو تو یہ بھی کوئی زندگی ہے جو تم صبح سے شام تک اس قسم کے کام کر کے گزار رہے ہو۔ کیا تم کو یہی بات پسند ہے کہ عمر بھر اس کشتی میں دریائے دجلہ کے اس کنارے تک کولھو کے بیل کی طرح چکر لگاتے رہو۔ میرا تو یہی خیال ہے بیٹا، کہ تم جیسے لائق لڑکے کو ایسی زندگی پر قناعت نہ کرنی چاہیے۔ خدا کے فضل سے، اٹھتی جوانی ہے، کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔"

نجم الدین تھوڑی دیر چپ رہا۔ اپنی موجودہ زندگی کے متعلق لگاتار کئی نقشے اس کے خیال میں آئے اور دماغ سے نکل گئے۔ وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ سچ مچ وہ اس زندگی سے اکتا گیا ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کچھ آوازیں اس کے کان میں گونج رہی ہیں۔ اور اسے نئے نئے مقامات کی طرف آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ اس وقت نجمی کی امیدوں کے دروازے نگاہوں کے سامنے کھلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

ایک بار پھر اس کے منہ سے نکلا، "جزیرۂ سلیمان!"

حاجی سلیمان نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا، "ہاں بیٹا، یہ جزیرۂ سلیمان ہی کا ذکر ہے۔ کتاب تمھارے سامنے رکھی ہے۔ تم اس کے عجیب حالات خود پڑھ لینا۔ اس کے کچھ صفحے کم ہیں۔ اگر پوری ہوتی تو اس کا شمار دنیا کی سب سے زیادہ عزیز چیزوں میں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس جزیرے میں ایسی ایسی چیزیں دیکھی اور سنی جاتی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے اس سے پہلے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں۔ میرے دادا نے بیان کیا

ہے کہ وہاں کنکروں کی جگہ یاقوت اور جواہر ہیں، ریت کی جگہ سونے کے ذرے ہیں۔ وہاں کی ہوا فرشتوں کے سے رسیلے اور سریلے گانوں سے گونجتی رہتی ہے۔ یہ مقام سلیمان علیہ السلام جیسے حکیم کے بھیدوں کا خزانہ ہے جو تمام جنوں اور انسانوں پر حکومت کرتے تھے۔"

اب نجمی نے ایک کمزور سی آواز میں کہا، "اور میری خالہ کا کیا ہوگا؟"

حاجی: میں یہ مکان بہت جلد انھیں بخش دوں گا۔ جیسے ہی تم میرا ساتھ دینے پر راضی ہو گئے، میں انھیں اس مکان کا مالک بنا دوں گا۔

نجمی کا دل خوشی سے ذرا اچھلا، پھر بولا: "اور شیخ عبدالسلام؟"

حاجی: میں ان کے لیے بھی اتنا چھوڑ جاؤں گا کہ وہ خوش ہو جائیں گے۔ مجھے اپنے مال

و دولت کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں بغداد کے فقرا کو بانٹ دوں، اس کے بعد سفر کروں۔ میرے نزدیک آیندہ فساد میں اس مال کے لٹ جانے سے اس کا خیرات کر دینا بہتر ہے۔

نجمی: اور آپ کب سفر کرنا چاہتے ہیں چچا جان؟

حاجی: دو دن کے بعد بیٹا، جہاز ملک ہندستان اور چین کی طرف جانے کے لیے تیار ہے۔ اسی پر ہم بھی چلیں گے۔

یہ سن کر نجمی الجھن میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

پھر حاجی سلیمان نے کہا، "میں تم سے اسی وقت تو جواب نہیں مانگتا۔ اگر تم میرا ساتھ دینا پسند نہ کرو گے تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا اور اگر تم میرے ساتھ چلنا منظور کرو تو دو دن کے بعد جہاز کو روانگی ہے۔ اس وقت تم یہ کتاب لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو۔ اس کے بعد جانے کا ارادہ نہ ہو تو پرسوں مجھے واپس کر دینا۔"

اس کے بعد حاجی سلیمان نے مسکراتے ہوئے نجم الدین سے مصافحہ کیا اور وہ کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے خاموشی کے ساتھ ساحل کی طرف بڑھا، تاکہ شیخ عبدالسلام کی کشتی آئے تو اس میں بیٹھ کر اس پار پہنچے۔

جہاز کا سفر

آخر نجم الدین نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ اس سفر میں حاجی سلیمان کے ساتھ جائے گا۔ جس روز "سمندری محل" نامی جہاز بغداد سے چلا، اس دن موسم بہت اچھا تھا۔ جہاز مسافروں سے بھرا ہوا تھا اور انھیں میں حاجی سلیمان بصری اور میاں نجم الدین بغدادی بھی تھے۔

نجمی کی خالہ حاجی سلیمان کے دیے ہوئے شان دار مکان میں چلی گئی تھیں جو بیچ شہر میں تھا۔ اور اب ان کی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ اسی طرح شیخ عبدالسلام کے برے دن بھی چلے گئے تھے۔ انھیں بھی حاجی جی نے ایک مکان دے ڈالا تھا۔ جو امیروں کے محلے رصافہ میں تھا۔ حاجی کی سخاوت سے نجمی کی خالہ کو اتنا مال اور ساز و سامان مل گیا تھا کہ ان کی باقی عمر کے لیے بہت کافی تھا۔ غرض یہ دونوں حاجی

اور نجمی کی سلامتی کے لیے دل سے دعا کرتے تھے اور ان کے شکر گزار تھے۔

جہاز کے بغداد کا ساحل چھوڑتے وقت نجمی کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ جب تک جہاز سے شہر کی عمارتیں نظر آتی رہیں۔ یہ حسرت کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس کے بعد غمگین اور پریشان حالت میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسی کے قریب حاجی سلیمان بھی چپ چاپ بیٹھے کچھ سوچ رہے۔

تھوڑی دیر میں ہوا آہستہ آہستہ چلنے لگی اور سورج کی سنہری کرنیں پانی کی موجوں پر ناچنے لگیں۔ نجمی کو سمندر کی سیر سے خوشی محسوس ہوئی اور اس کی دل کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ ادھر حاجی سلیمان نے جزیرۂ سلیمان کی باتیں چھیڑ دیں۔ جس کی تلاش میں دونوں بغداد سے روانہ ہوئے تھے۔

نجمی: چچا جان، کیا آپ کو اپنے دادا جان کے سوا کسی اور شخص کا حال معلوم نہیں جس نے اس جزیرے کی سیر کی ہو۔

حاجی: نہیں، ہمارے سوا کسی کو اس جزیرے کا حال معلوم نہیں۔ ہاں، کیا تم نے وہ کتاب پڑھی؟

نجمی: جی ہاں، پڑھی تو ہے، مگر اس میں تو ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جن پر یقین نہیں آتا۔

حاجی: تم نہ مانو تو یہ اور بات ہے، ورنہ میرے دادا جان نے تو سب کچھ وہی لکھا ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

نجمی: (ہنستے ہوئے) وہ تو لکھتے ہیں، اس جزیرے کے کنکر، موتی، یاقوت اور ہیرے کے تھے۔

حاجی: تو نجم الدین، تم ان باتوں کو غلط سمجھ رہے ہو؟ مجھے تو اپنے دادا جان کی لکھی ہوئی ایک بات پر بھی شبہ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر حاجی سلیمان نے کتاب جزدان سے نکالی اور اسے پڑھ پڑھ کر سنانا شروع کردیا۔ حاجی صفحے پر صفحے سناتے جاتے تھے اور نجمی کے دماغ پر کتاب کے مناظر کا نقشا کھنچتا چلا جاتا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے خیال میں کسی جادو کی دنیا کی سیر کر رہا ہو۔

اسی طرح دن پر دن گزرتے گئے اور جہاز چین آرام کے ساتھ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے پر ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس کا پہلا اسٹیشن جزیرہ سراندیپ تھا۔ جہاز کا کپتان ان سمندروں سے خوب واقف تھا۔ دن ہو یا رات، آسمان کھلا ہوا ہو یا اس پر بادل چھائے ہوئے ہوں، وہ کسی بات کی پروا نہ کرتا تھا۔ برابر سفر میں مصروف رہتا

تھا۔ وہ چین سے ایک ایسی مشین لایا تھا جس کے ذریعے اسے سفر کا رُخ معلوم ہوتا رہتا تھا، اس لیے جہاز چلانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ ہوا بادبانوں میں بھرتی رہتی اور جہاز مزے سے چلتا رہتا۔

اب نجم الدین کی ہمت روز بروز بڑھ رہی تھی اور نیلے آسمان کے نیچے، بیچ سمندر میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بغداد میں جو زندگی پیچھے گزار رہا تھا، بڑی معمولی اور اوتا زندگی تھی جو زندگی اب شروع ہوئی ہے، وہ بے شک ٹھاٹھ کی اور شان دار ہے۔ وہ رات کے وقت جہاز سے آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کا تماشا دیکھتا اور جہاز کے چلنے سے جو آواز آتی، اسے سنتا اور لطف اٹھاتا۔ اس طرح چلتے چلتے کوئی دو ہفتے کے بعد جہاز جزیرہ سراندیپ کے قریب پہنچا۔ اس وقت جہاز کے مسافروں میں سراندیپ کی پہاڑیوں، وادیوں اور وہاں کے شہروں پر بات چھڑ گئی، لیکن نجمی کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ اس کے دماغ میں تو جزیرۂ سلیمان بسا ہوا تھا۔ رہ رہ کر ہلالی چٹانیں اور ہیرے اور موتیوں کے کنکر خیال میں آتے اور سلیمان علیہ السلام کے خزانوں کا خیالی نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگتا۔

اتنے میں سورج ڈوبنے سے پہلے مشرق کی طرف بعض جزیروں کی جھلک نظر آئی اور ایسا معلوم ہوا جیسے پانی کی سطح پر داغ ایسے تیر رہے ہیں پھر ایک کالا کالا سا دھبا آسمان پر

نظر آیا۔ جہاز کے مسافر اٹھ اٹھ کر بے چینی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

جس وقت سورج ڈوبنے لگا، وہ سیاہ دھبا بہت بڑا اور خوب اونچا ہو گیا۔ یکایک اس نے بہت بڑے بادل کی شکل اختیار کر لی اور قریب قریب آدھے آسمان پر چھا گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شدت کی گرمی ہونے لگی۔ ہوا کے جھونکے خوب زور سے چلنے لگے جہاز موجوں کے زور سے تنکے کی طرح اڑا اڑا پھرتا تھا۔ دوسری آفت یہ نازل ہوئی کہ آسمان سے طوفانی بارش ہونے لگی۔ ہر طرف چیخ پکار مچ گئی۔ موت کا نقشہ سب کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہی سمندر جو تھوڑی دیر پہلے پُرسکون تھا، حد سے زیادہ بپھرا ہوا اور ڈراونا بن گیا۔

اس رات نجمی کی پلک تک نہ جھپکی اور اسی کی کیا، کسی مسافر کی بھی آنکھ نہ لگ سکی۔ دوسرے دن جب سورج نکلا تو اس کی یہ حالت تھی جیسے روشنی سے ڈرتا ہو۔ سیاہ بادلوں سے کسی کسی وقت اس کی جھلک نظر آتی اور پھر چھپ جاتا۔

لوگوں نے جہاز کے کپتان سے پوچھا کہ سراندیپ کے ساحل پر کب پہنچیں گے تو اس نے سر ہلا کر کہا، "ہمیں طوفان نے جنوب کی طرف دھکیل دیا ہے۔ دیکھیں کب پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔"

اب یہ حال تھا کہ دن کسی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا۔ لوگوں کو ایک ایک گھڑی دوبھر ہو گئی تھی، مگر لوگ ساتھ ہی رات کے آنے سے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں پہلے کی طرح پھر اسی خوف اور وحشت کا سامنا نہ ہو۔

حاجی سلیمان کو بخار پر بخار آ رہے تھے۔ بچارا بے حواس پڑا ہوا تھا۔ نجمی نے مقدور بھر اسے سنبھالنے کی کوشش کی، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

بڑی خیر ہوئی کہ دوپہر کے بعد ہواؤں کا زور کچھ کم ہوا۔ آسمان کے کنارے سے کھلے اور بادلوں کا رنگ ہلکا پڑ گیا، مگر بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑا تھوڑا پانی برس ہی جاتا تھا۔ لوگ جہاز کے کناروں پر کھڑے ہو ہو کر زمین کے آثار دیکھنے لگے۔ نجمی اس وقت سخت الجھن میں پڑا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ ناحق میں نے ایک پیر آدمی کا کہنا مانا اور اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر اس مصیبت کو مول لیا۔ اللہ ہی جانے اس سفر کا انجام کیا ہو۔

نجمی ابھی اسی سوچ میں تھا کہ اسے آسمان کے کنارے پر پھر ایک دن پہلے کا ایسا کالا دھبا نظر آیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا اور ایک ملاح کو بلا کر پوچھا "ذرا اُدھر دیکھنا، کیا یہ ایک اور طوفان کی نشانی ہے۔"

ملاح نے اس طرف نظر جمائی اور خاموشی سے دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر ناامیدی کی حالت میں ہلایا اور بغیر جواب دیے چلا گیا۔

نجم الدین پریشان اور بدحواس سا بنا ہوا حاجی سلیمان کے قریب جا بیٹھا اور اس سے کہا، "بیچا، ایک اور طوفان آرہا ہے۔"

حاجی نے اسی کمزوری میں سر اٹھا کر دیکھا اور کہا، "لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ آسمان تھوڑا تھوڑا صاف ہوتا جاتا ہے بیٹا!"

اب جو نجمی نے دیکھا تو سورج بیچ بیچ بادلوں میں سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔ آسمان کے کنارے کھلنے لگے اور بادلوں کے نیچے نیلے ٹکڑے ظاہر ہونے لگے۔ یکایک حاجی سلیمان خوشی سے چلّائے: "زمین، زمین!"

اب جہاز کے مسافر اور ملاح سب اسی طرف دیکھنے لگے اور کپتان نے ملاحوں کو حکم دیا کہ جہاز کا رخ بدل دیں، تاکہ زمین کی طرف چلنے لگے۔ ملاحوں میں جان سی آگئی اور بڑی مستعدی سے اپنے کام پر لگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد رات ہوگئی اور ہوا میں پھر زور پیدا ہوگیا موجیں شدت سے اٹھنے لگیں۔ موسلا دھار پانی برسنے لگا، لیکن ملاحوں کی نگاہیں زمین کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ان کی ہمتیں پست نہ ہوئیں، بلکہ ان کا ساتھ مسافروں نے بھی دیا۔ نجم الدین بھی خاموشی کے ساتھ انھیں مدد دے رہا تھا۔

یہ لوگ ابھی اپنی کوشش میں مصروف تھے کہ ایک طرف تیز روشنی کا ایک ستون سا نظر آیا جو آگ کی طرح سرخ تھا۔ یہ کبھی آسمان کی طرف اٹھتا اور کبھی چھپ جاتا۔ اس تماشے کو دیکھ کر لوگوں پر بڑا سناٹا چھا گیا۔ پھر جہاز کے کپتان نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا، "آگ کا جزیرہ!"

اور دوسرے ملاح پکار اٹھے: "شیطانوں کا جزیرہ!"

اب جہاز کے مسافر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کپتان اور ملاحوں کے آس پاس جمع ہو کر ان کی باتیں سننے لگے۔

جہاز کا کپتان، جس کا نام حماد موصلی تھا، بولا، "میں اس سرزمین کو بیس سال سے جانتا ہوں۔ میں سمندر کے اسی حصے میں اسی جگہ تھا کہ ایسی ہی تیز آندھی چلنے لگی۔ پھر اس نے خاموشی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا، "ہمیں ہوا زبردستی دھکیل رہی تھی جیسے اس وقت ہو رہا ہے۔ ہمیں مجبوراً ہوا کے ساتھ چلنا پڑا۔ آخر ہم اس جزیرے کے ساحل پر آ پہنچے۔ یہ ساحل اتنا خوب صورت ہے اور یہاں کے مناظر اتنے دل بھانے والے ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اتنا خوب صورت ساحل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا، مگر یہ سب شیطان کا فریب ہے، تاکہ جو غریب ساحل کے قریب آئیں، انھیں ان خوش نما نظاروں کے جال میں پھانس کر غلام بنا لیں۔ اس ساحل پر جو مسافر بھی اترا، پھر کبھی اس کا نشان نہ ملا۔"

نجم الدین یہ سن کر ہنسا اور کپتان سے کہا، "مگر آپ نے ان شیطانوں میں سے کسی کو کبھی دیکھا بھی ہے؟"

حماد موصلی بھڑک اٹھا اور غصے سے کہا، "تم میری بات کا مذاق اُڑا رہے ہو، اس لیے کہ تم جاہل ہو۔"

حاجی سلیمان کو ابھی تک

بیماری سے نجات نہیں ملی تھی، مگر جہاز کے لیے خطرہ محسوس کر کے وہ اپنا مرض بھول گئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کر سب کے ساتھ کپتان کی باتیں سننے لگے۔ انھوں نے کپتان کے غصے بھرے الفاظ سنے تو کہا:

"جناب، نجم الدین مسخرہ پن نہیں کر رہا ہے، بلکہ آپ سے ایک بات پوچھ رہا ہے۔"

کپتان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور نجم الدین پر ایک کڑی نظر ڈال کر کہا: "اس زمین پر بسنے والے صرف رات ہی کو نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے نیلے رنگ کے خوف ناک شعلے پھینکتے ہیں اور ان کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے پانی خوب کھول رہا ہو، جس وقت آندھی چلتی ہے۔ وہ جادو کے زور سے جہاز کو ساحل کے قریب کھینچ لاتے ہیں، تاکہ مسافر یہاں کے خوش نما منظر دیکھ کر آسانی سے دھوکے میں آ جائیں۔"

"پھر تو وہ لوگ بڑے ناپاک شیطان ہیں۔" نجمی نے کہا۔

کپتان اس کی بات سے پھر بھڑک اٹھا اور کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے جھٹلا

حاجی سلیمان نے دھیرے سے نجمی کا بازو پکڑا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا، لیکن نجم الدین ضبط نہ کر سکا اور کہہ اٹھا: "میں آپ کو نہیں جھٹلا رہا ہوں کپتان صاحب! مجھے تو ان شیطانوں پر حیرت ہے جو ایسی بے کار باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ کیا کوئی اور کام نہیں ہے ان کم بختوں کو؟"

قریب تھا کہ کپتان غصے سے بے قابو ہو جاتے، مگر ہوا کے ایک نہایت تیز جھونکے سے جہاز ایک پہاڑ جیسی اونچی لہر پر جا پڑا اور ایسی چیخ پکار مچی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب

اپنی جان کی خیر منا رہا تھا۔ حاجی سلیمان سے یہ زبردست جھٹکا برداشت نہ ہو سکا اور وہ جہاز کے تختے پر گر پڑے۔ نجمی انھیں سنبھالنے کے لیے بڑھا۔ اتنے میں آسمان کی ایک طرف سے ایک بڑا شعلہ لپکا اور ایک دم اوپر کی جانب اٹھ کر تھوڑی دیر میں غائب ہو گیا۔ اب پھر پورا سمندر اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا اور لوگوں پر دہشت چھائی ہوئی تھی۔

یہ رات کسی طرح کاٹے نہ کٹتی تھی۔ مسافروں کے دل میں یہ خیال سما گیا تھا کہ خبیث شیطانوں نے غلبہ پا لیا ہے اور وہ دن نہیں ہونے دیتے۔ بے چارا نجمی اپنے سرپرست ساتھی حاجی سلیمان کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا جن کی کمزوری بہت بڑھ گئی تھی اور اپنے بستر پر پڑے کراہ رہے تھے۔ جب جہاز موجوں کے زور سے کروٹیں لینے لگتا تو ان کی تکلیف بڑھ جاتی۔

اس رات کو کسی کی پلک تک نہ جھپکی۔ خدا خدا کر کے دن کی روشنی نظر آئی۔ ساتھ ہی جزیرے کا ساحل بھی قریب آ پہنچا۔ تب کہیں مسافروں کی جان میں جان آئی۔ ادھر ہوا بھی کم ہوئی اور جہاز نے اس انوکھے جزیرے کے کنارے لنگر ڈالا جس کا خوش نما اور پیارا منظر لوگوں کا دل چھینے لے رہا تھا۔

جزیرے کا نظارہ

اس جزیرے کی چٹانیں، بڑی خوش نما اور وضع قطع میں بڑی لاجواب تھیں۔ ان کے رنگ اور شکلیں بڑی پیاری تھیں۔ کوئی زبرجد کے سے رنگ کی سبز تھی تو کوئی قرمزی رنگ کی سرخ تھی۔ ان کے درمیان نیلے رنگ کا شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ چٹانوں کے بیچ میں جو جگہ خالی رہ گئی تھی، اس میں چھوٹے چھوٹے پودوں اور درختوں کی تر و تازہ اور سبز جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ان میں طرح طرح کے خوش رنگ پھول لگے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں کی قدرتی تراش سے عجیب عجیب شکلیں بن گئی تھیں۔ کسی کی وضع چھوٹے سے گنبد کی سی تھی، کسی کی آرائشی محراب کی سی۔ غرض یہ مقام قدرت کی حسین دست کاریوں کا بے نظیر نمونہ بنا ہوا تھا۔

یوں تو جہاز کے سارے مسافر یہاں کی سیر سے بہت زیادہ خوش تھے۔ حماد موصلی خود بہت دل چسپی محسوس کر رہا تھا، لیکن ان سب سے زیادہ حیرت نجم الدین کو تھی جو اس جزیرے کی سیر

میں بالکل کھویا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ کبھی پہاڑ کے دامن پر نظر ڈالتا کبھی ساحل کی لمبائی کو دیکھنے لگتا اور پھر سمندر پر نگاہ دوڑاتا جو اس وقت بالکل ٹھہرا ہوا تھا جیسے وہ بھی جزیرے کی سیر سے لطف اٹھانا چاہتا ہو۔ حاجی سلیمان نے بھی جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایسے بے مثال مقام کی سیر میں مشغول ہو گیا۔ اوروں کی طرح وہ بھی پہلے کی تکلیفیں بالکل بھول گیا تھا۔ اب اس کے چہرے پر خوشی اور تازگی کے آثار ظاہر تھے۔ سب مسافر آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ جہاز ان کے قہقہوں اور لطیفوں سے گونج رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگ کھانا تیار کرنے اور سامان درست کرنے میں مصروف ہو گئے جو طوفانی ہوا کی وجہ سے چاروں طرف تتر بتر پڑا ہوا تھا، لیکن ان میں سے کوئی جہاز سے اترا نہیں، اس لیے کہ جہاز کا کپتان ملاحوں کو حکم دے چکا تھا کہ جب جہاز کے بادبان اور باقی سب سامان ٹھیک ہو جائے تو سفر دوبارہ شروع کر دیا جائے۔

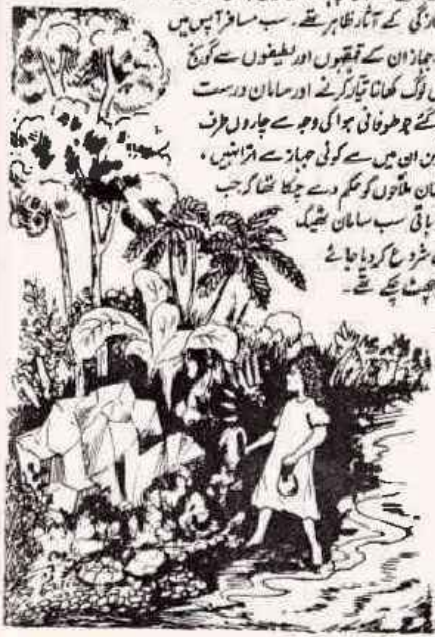

اس وقت بادل چھٹ چکے تھے۔ تیز ہوا موقوف ہو چکی تھی۔ ایک طرح کا اطمینان اور خوشی ہر طرف اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی۔ نجم الدین پر اس خوشگوار سماں نے ایسا اثر کیا کہ وہ جہاز میں چین سے نہ رہ سکا۔

اس نے بے اختیار ہو کر حاجی سلیمان سے اجازت مانگی کہ تھوڑی دیر ساحل پر اتر کر سیر کروں گا اور ادھر ادھر ٹہل کر واپس آجاؤں گا۔ حاجی نے اجازت دے دی تو نجمی نے پہلے کھانا تیار کیا، پھر حاجی کے لیے بستر وغیرہ ٹھیک کیا۔ اس کے بعد، اپنے لیے تھوڑا سا ناشتہ لے کر جہاز سے اترا۔

نجمی جب ساحل پر سے گزر رہا تھا تو اس وقت شفاف پانی سفید ریتیلے میدان پر آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ مونگے کے مختلف رنگوں کے ٹیلے اس کے نیچے سے اپنی بہار دکھا رہے تھے طرح طرح کی مچھلیاں، جو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زبرجد اور موتی وغیرہ کی بنی ہوئی ہوں، سو وہ کنارے کی طرف اپنے سر اٹھا رہی تھیں، گویا وہ اس انوکھے اور کم سن سیاح کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ چکنے ساحل پر چٹانیں سبز اور سرخ رنگ کی کائی سے ڈھکی پڑی تھیں۔ نجمی انھی پر سے ہوتا خلیج کے آخری کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں اس نے دیکھا کہ اونچی اونچی چٹانوں سے ایک چھوٹی سی نہر جاری ہے جس سے سفید رنگ کا فوارہ چھوٹ رہا ہے اور سورج کی جگمگاتی ہوئی کرنیں اس میں طرح طرح کے رنگ پیدا کر رہی ہیں۔ وہ نہر کے قریب گیا اور تھوڑا پانی چلو میں لے کر پیا تو بڑا لطیف اور میٹھا تھا۔ خوب پیا۔ جس چٹان میں سے پانی آرہا تھا، اس کے نیچے دیکھا تو ایک بڑا صحن ایسا نظر آیا۔ نجمی وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک بڑے غار کا راستہ ہے جس کے آس پاس سبز رنگ کی شفاف چٹانیں ہیں۔ پھر راستے میں سے جھانکا تو اس کے اس پار ایک بڑا وسیع میدان نظر آیا جو چاندنی سے ملتی جلتی روشنی سے روشن ہو رہا تھا۔

نجمی کو اس میدان میں عجیب شکلوں کے ستون نظر آئے جن میں سے بعض زمین سے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور بعض غار کی چھت سے نیچے کو لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ہری ہری جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ سماں اتنا دل لبھا رہا تھا کہ نجمی آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا غار کے اندر چلا گیا، جہاں اسے ہر قدم پر پہلے سے زیادہ خوشنما منظر ملتا۔ اور وہ حیران ہو کر دیکھنے لگتا۔ اس درمیان میں ایک زرد رنگ کا شعلہ رہ رہ کر کسی چٹان کے سوراخ سے نکلتا اور اس کی وجہ سے اس جگہ کی روشنی اور رونق بڑھ جاتی۔

نجمی یوں ہی چلتا رہا۔ اسے وقت کا بھی پتا نہ چلا کہ اس طرح کتنے گھنٹے اس سیر میں گزار چکا ہے۔ آخر اسے تھکن محسوس ہونے لگی۔ اب اسے اپنے چھوڑے ہوئے ساتھی یاد آنے لگے

اور جہاز کے کپتان کا خیال آیا جس نے اس جزیرے کے شیطانوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ سوچ کر آہستہ آہستہ خوف اس کے دل میں سمانے لگا۔ اس نے چاہا کہ جس طرف سے آیا ہے اسی طرف لوٹ جائے، اس لیے وہ ایک ہی شکل کی جھاڑیوں اور ستونوں کے درمیان جلد جلد قدم بڑھانے لگا، لیکن اس غار کا راستہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں سے چلا تھا اور اب اسے کہاں جانا چاہیے۔ اس کوشش میں اکثر وہ اسی جگہ پہنچ جاتا جہاں سے پہلے چلا تھا۔

وہ اس طرح اس وسیع غار میں بغیر راستہ پائے ہوئے اتنی دیر تک چلتا رہا کہ اسی حال میں دن ختم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ طرح طرح کے ہول دل میں آ رہے تھے۔ اتنے میں اسے روشنی کی ایک کرن نظر آئی جسے دیکھ کر وہ خوشی سے چلا اٹھا اور جس طرف سے یہ کرن آ رہی تھی، ادھر تیزی سے دوڑا، مگر وہاں پہنچا تو سمندر کا وہ کنارہ نظر نہ آیا جس کی امید میں اس طرف بڑھا تھا، بلکہ ایک وسیع میدان دیکھا جسے اونچی اونچی چٹانوں کا ایک دائرہ گھیرے ہوئے تھا۔ اسے ناامیدی سے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، مگر جب اپنے آس پاس سورج کی روشنی چمکتی دیکھی اور رنگ برنگی خوش نما چٹانوں پر نظر پڑی تو نجمی کو ایک طرح کا اطمینان ہوا۔ اس نے ایسی بناوٹ کی اور اتنی خوش رنگ چٹانیں زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ یہ چٹانیں اتنی شفاف تھیں کہ مختلف رنگوں کی لہریں ان کے آر پار نظر آ رہی تھیں۔ انھی چٹانوں کی

تراش سے ستونوں، میزوں، کرسیوں کی شکلیں بن گئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس قسم کی تمام چیزیں ان غاروں کے درمیانی حصوں میں بکھیر دی گئی ہوں۔

نجمی کو یہ میدان ایک ایسے شان دار محل کی طرح معلوم ہو رہا تھا جو جن قوم کے امیروں کے لیے سجایا گیا ہو۔ اس وقت اسے جہاز کے کپتان کی بات یاد آئی اور اس نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ کپتان کی بات کیوں نہ مانی اور اپنے ساتھیوں میں جہاز کے اندر ہی کیوں نہ بیٹھا رہا، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس مقام کے مناظر اور چیزوں کی تراش خراش نے پھر اس کی بے قراری دور کر دی اور اس کا جی ان عجیب تماشوں کی سیر میں بہل گیا۔

چلتے چلتے جب نجمی میدان کے ایک سرے پر پہنچا تو اسے شفاف پانی کی ایک جھیل نظر آئی جس پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی تھیں اور کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا اس کی سطح کو لہرا کر اور زیادہ خوش نما بنا دیتی تھی۔ جھیل کو دیکھ کر اس کے جی میں آئی کہ جوتے اتار کر اس میں اترے۔ اب جو پانی کی تہ پر نظر پڑی تو اسے پوری تہ اپنے قدموں کے نیچے جگمگاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے تہ میں سے مٹھی بھر کر کنکر اٹھا لیے اور ان کی رنگت اور چمک دمک پر غور کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی کہ اس کے ہاتھ میں بیش قیمت جواہرات چمکتے ہوئے تھے۔ ان جواہرات میں ہیرا، زبرجد، عقیق اور یاقوت وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ اب تو نجمی خوشی اور حیرت کے مارے چلا اٹھا۔ اس وقت اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اس کا عجیب حال ہوا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے پھر زمین چاہا، جھک کر تہ سے کنکر اٹھائے اور یہ سب جواہرات نکلے۔ پھر اس نے انھیں پانی میں پھینک دیا اور پانی سے نکل کر خشکی کے کنکر مٹھی میں بھرے تو وہ بھی پہلے کنکروں کی طرح قیمتی جواہرات ثابت ہوئے۔

اب تو نجمی کو بڑی بے چینی ہوئی اور اس نے اپنے جی میں کہا "ارے، یہ تو جواہرات ہیں جواہرات!" اور وہ دیوانے کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اس نے چاہا کہ جلد سے جلد اونچی چٹانوں پر جا پہنچے تاکہ وہاں سے سمندر کا نظارہ کر سکے اور اپنے ساتھ والوں کو یہ خوش خبری سنائے۔ جیسے تیسے یہ گرتا سنبھلتا اونچی چٹانوں پر پہنچا اور وہاں سے اپنی نظریں دوڑاتا اور لوگوں کو پکارنا شروع کیا، لیکن سمندر کا کنارہ نہ کوئی نظر آیا اور نہ کسی نے اس کی پکار کا کچھ جواب دیا، مگر ابھی اس نے ہمت نہ ہاری اور برابر ادھر سے ادھر دوڑتا اور ساتھیوں کو نام لے لے کر پکارتا رہا۔ اتنے میں اسی خلیج کا کنارہ نظر آیا جس کے قریب جہاز نے لنگر ڈالا تھا۔ پھر جو ذرا نظریں دوڑائیں تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا جہاز سمندر کا سینہ

چڑتا آگے بڑھتا جا رہا ہے اور خاصا دور نکل چکا ہے۔ یہ دیکھ کر قریب تھا کہ بجی غش کھا کر گر پڑے۔ مگر پھر سنبھل گیا اور دیوانوں کی طرح کپتان، حاجی سلیمان اور دوسرے ساتھیوں کو چلا چلا کر آوازیں دیں۔ یہ کوشش بھی بے فائدہ ثابت ہوئی۔ آخر تھک کر چور ہو گیا اور ایک جگہ سیدھا سیدھا لیٹ کر آس پاس دیکھنے لگا۔

اس وقت جزیرے کا نظارہ اتنا پیارا اور دل لبھانے والا تھا کہ اس کی نگاہیں اس میں ڈوبی جاتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت اپنے آپ کو خوش نما ظاہر کرنے پر تلی ہوئی ہے تاکہ اس چھوٹے سیاح کی گھبراہٹ اور وحشت کو راحت اور فرحت سے بدل دے۔

جزیرے میں مہمانی کا سامان

اب نجم الدین کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ جزیرے میں اکیلا اور بے یار و مددگار رہ جانے پر صبر کرے اور خدا کی مرضی پر اس کا شکر ادا کرے۔

وہ بے چارا بغداد سے اس لیے چلا تھا کہ جزیرۂ سلیمان کے سفر میں حاجی سلیمان کا ساتھ دے، لیکن اس بات کا اس نے خواب تک نہ دیکھا تھا کہ وہ اس جزیرے میں بالکل اکیلا جا پڑے گا جس کو خدا نے خوب صورتی اور دولت مندی میں بے مثال اور بے شمار جواہرات سے مالا مال بنا رکھا ہے۔ لیکن بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ پورا جزیرہ ویران نظر آتا تھا جس میں کسی انسان کا پتا نہ تھا۔ آدمی تو آدمی، جانوروں میں بھی مچھلیوں کے سوا کسی جانور کا نام نہ تھا۔ مچھلیاں البتہ وضع وضع کی اور رنگین مونگے کی گھاٹیوں کے درمیان تیرتی پھرتی تھیں۔

بجی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اکیلا اس جزیرے میں کس طرح زندگی گزارے گا۔ بھوک کی حالت میں کیا کھائے گا اور جب کپڑے پھٹ جائیں گے تو کیا پہنے گا؟ بلکہ وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ جب رات پوری طرح سرد اور تاریک ہو جائے گی تو کہاں رہے اور رات بسر کرے گا؟ جزیرے میں بڑے خوش نما اور بے حد قیمتی ہیرے جواہرات حد اور حساب سے زیادہ تھے، مگر ان سب سے زندگی کی ضرورتیں کس طرح پوری ہوں گی، جب کھانا نصیب نہ ہوا تو یہ مال یہ دولت کس کام کی؟

تھوڑی دیر کے بعد وہ حیرانی اور پریشانی کی حالت میں اپنی جگہ سے اٹھا اور نیچے کی طرف واپس

ہوا، جہاں جھیل تھی۔ اس وقت خوف اور فکر اس کے دل پر چھائی کر رہے تھے۔ صبح سے ایک ذرا بھی اس کے منھ میں نہ گیا تھا۔ مگر غم اور پریشانی کی شدت سے اسے بھوک ہی نہ لگی۔ اب سورج تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا، اس لیے سب سے پہلے اسے پناہ کی جگہ تلاش کرنے کا خیال آیا۔ وہ جھیل کے کنارے میدان پر چلتا رہا جو جنوب مغرب کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ سبز گھاس اور پھول اس پر چھائے ہوئے تھے اور بہت سے کھجور وغیرہ کے درخت جا بجا

اُگے ہوئے تھے۔ اتنے میں اس کی نظر ناریل کے درختوں پر جا پڑی جو خوش نما اور ہرے تاج اپنے پھلوں سے لدے ہوئے سمندر کی طرف جھکے نظر آ رہے تھے۔

انھیں دیکھ کر بجی بہت خوش ہوا اور ایک درخت کے نیچے پہنچ کر بعض پھل جمع کیے جو زمین پر گرے پڑے تھے۔ انھیں توڑ کر ان کا سخت چھلکا الگ کیا، پھر ان کا دودھ پی کر کھوپرا نکالا اور جی بھر کے کھایا۔ اب اس کو اطمینان ہوا کہ جزیرے میں بھوکا پیاسا تو ہرگز نہ مرے گا۔ اس کے بعد اس نے تھوڑے سے پھل ساتھ لیے اور جھیل کے کنارے کی طرف چلا، تاکہ اس کے قریب ہی کسی غار میں پناہ لے اور رات بسر کرے۔ چلتے چلتے پتھر کے ایک ٹکڑے سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑھکا تو اس سے کسی دھات کی سی چمک پیدا ہوئی۔ اٹھا کر غور سے دیکھا تو اس پتھر کے ٹکڑے میں سونے کی لکیریں نظر آئیں اور وہ بے اختیار چلا اٹھا، "اور سونا بھی ہے!"

پھر وہ زمین کی طرف جھکا اور جو بوٹیاں اور گھاس زمین کو ڈھانکے ہوئے تھی، اسے ہٹا کر دیکھا تو اس کے نیچے مٹی میں بھی سونے کے ذرے نظر آئے جو زرد مٹی میں ملے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے اور کھودا تو یہ ریت کے پیلے سونے سے چمک رہی تھی۔ اس نے حیرت کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر

اسے وہ جواہرات یاد آئے جو اس نے جھیل کی تہ میں دیکھے تھے۔ اس کے بعد اپنے جمع کیے ہوئے ناریلوں پر ایک نظر ڈالی اور مسکرا کر کہا "میرے نزدیک تو ناریل کا ایک بیج اس سنہری مٹی سے زیادہ قیمتی ہے۔ بلکہ یہ جگمگاتے ہوئے ہیرے بھی اس کے سامنے کوئی قیمت نہیں رکھتے"۔

یہ کہہ کر نجمی نے بیج پھر اٹھا لیے اور چمکیلی ریت کو اپنے قدموں سے روندتا ہوا جھیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب اس کی توجہ ان چیزوں کی طرف سے بالکل ہٹ چکی تھی اور وہ چیزوں کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

جب وہ جھیل پر پہنچ گیا تو اس نے شمال کی طرف منہ کر کے چلنا اور چٹانوں کے اندر پناہ کی جگہیں تلاش کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد اسے ایک شفاف سبز چٹان کی دیوار میں ایک سایہ دار جگہ نظر آئی اور اس کے اندر رنگین پتھر کا ایک بڑا ٹکڑا دکھا جو غالباً میز کا کام دینے کے لیے تراشا گیا تھا۔ اس کے آس پاس نقشی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک تخت ایسا بچھا ہوا تھا۔ غار کے دروازے پر کئی نقشیں اور نازک ستون کھڑے ہوئے تھے جن سے بڑے بڑے شان دار محلوں کی شان و شوکت ظاہر ہو رہی تھی۔ اس موقع پر غار کے اندر کسی باریک سوراخ یا روشن دان سے اسے شعلے کی لپک ایسی نظر آئی جو برابر قائم تھی۔ اس کو دیکھ کر نجمی کو اطمینان ہوا کہ اب رات کا اندھیرا تکلیف نہ دے گا۔

غرض آرام کرنے کے لیے ایسی اچھی جگہ جو ملی تو نجمی کو بڑا اطمینان ہوا۔ اس نے ناریل تو ایک میز پر رکھ دیے اور خود تخت پر پاؤں پھیلا کر بڑے آرام سے لیٹ گیا۔ تھک کے چور تو ہو ہی رہا تھا تھوڑی ہی دیر میں سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔

بونوں کا دیس

غار کے سامنے میدان میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی جھیل کا پانی چاند کے عکس سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ نجمی کو نیند کے مزے لیتے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی جب نیند کا زور کم ہوا تو یکا یک اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی بچی رسیلی اور دور دبھری آواز میں کچھ گا رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف مڑ مڑ کے دیکھنے لگا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے، مگر اسے کوئی نظر نہ آیا تو اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ آواز اور زیادہ قریب آنے لگی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سامنے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس وقت جو تماشا نظر آیا اس سے اس کی حیرانی کا کوئی اندازہ نہ رہی۔ اپنے جی سے پوچھا کہ یہ سب کچھ جاگتے میں ہو رہا ہے یا خواب میں آنکھوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر دیکھا تو وہ کھلی ہوئی تھیں۔ پھر منہ پر انگلی رکھی اور اسے دانتوں سے کاٹا تو تکلیف محسوس ہوئی اور چلا اٹھا کہ بے شبہ میں ہوش میں ہوں اور جاگ رہا ہوں۔

جب پہلی ہی آواز اس کے کان میں آئی تو اسے یقین آیا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، بالکل ٹھیک دیکھ رہا ہوں، یہ خواب ہرگز نہیں ہے۔

ہوا یہ کہ جھیل کے کنارے اسے کچھ چھوٹے چھوٹے قد کے تھوڑے سے آدمی نظر آئے جو ایک حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ ان میں سے کسی کے قد کی لمبائی بھی دو بالشت سے زیادہ نہ تھی۔ ہر ایک کا لباس تر اونچا اور ٹوپی لمبی اور نوک دار گاؤدم وضع کی۔ ان ٹوپیوں کے رنگ ان شفاف رنگین چٹانوں سے ملتے جلتے معلوم ہوتے تھے جو ساحل پر اور غاروں کے اندر نظر آئی تھیں۔ بعض ٹوپیاں نیلے رنگ کی تھیں، بعض سرخ یا گلابی، بعض کا رنگ جھلکتا ہوا زرد اور بعض کا سبز اور بنفشی۔

نجم الدین کو ان لوگوں کے چہرے چاندنی میں دور سے برف کی طرح بالکل سفید نظر آ رہے تھے۔ اور ان کے سنہرے زرد بال ٹوپیوں کے نیچے سے قدموں تک لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے گانے کی آواز پر دھیان لگایا تو یہ گیت سمجھ میں آیا

اے چٹانوں کے پھول
کہیں جا نہ بھول

پیارا موسم ہے یہ
نیارا موسم ہے یہ

تو ہے جانِ بہار
تجھ سے اس کا نکھار

اہا ہا ہا اہا
اہا ہا ہا اہا
کیا کہوں کیا ہے تو
نورِ دل کا ہے تو
تجھ پہ خوشیاں نثار
اہا ہا ہا اہا

نجمی نے دیکھا کہ اس مجمع میں ایک لڑکی گیت شروع کرتی ہے اور باقی لوگ اسی گیت کو دہراتے ہیں۔ اس کی آواز اتنی رسیلی اور میٹھی ہے کہ اس نے اپنی عمر میں کبھی نہ سنی تھی۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ اس لڑکی کو چھینک آئی اور جیسے ہی اس نے کہا، "آچھیں"،

اس کے سب ساتھیوں نے بھی آواز ملائی، "آچھیں آچھیں"۔

یہ سب چھینکتے جاتے تھے اور چھینکوں کے بیچ بیچ قہقہے

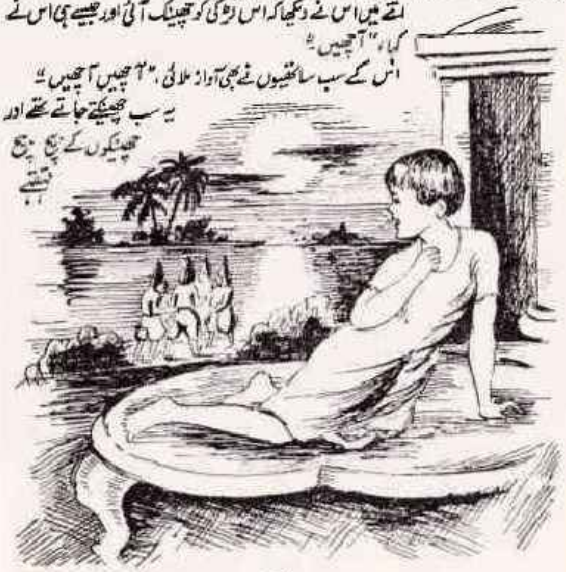

بھی لگاتے جاتے تھے۔ پھر انھوں نے چھوٹے چھوٹے رومال نکالے اور اپنی ناکوں پر رکھ لیے۔

یکایک وہ لڑکی جو گا رہی تھی، بول اٹھی، "میری ناک میں کچھ عجیب سی بو آرہی ہے۔"

اب اس کے ساتھ والے بھی کہنے لگے، "ہمیں بھی کچھ عجیب سی بو آرہی ہے۔"

اسی وقت ان سب نے گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر مڑ کے دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں ان میں سے ایک شخص بڑی شان کے ساتھ لڑکی کی طرف بڑھا۔ اس کی لمبی پیلی سنہری داڑھی زمین سے لگ رہی تھی۔ جب یہ شخص لڑکی کے قریب پہنچا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی داڑھی اوپر اٹھائی پھر جھک کر کہا، "مجھے تو وہ عجیب خوش بو اس طرف سے آرہی ہے۔" ساتھ ہی اس طرف اشارہ کیا جدھر نجمی کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

اب وہ خوب صورت لڑکی مڑی اور غار کی طرف چلنے لگی۔ جو لوگ ساتھ تھے، انھوں نے اسے حلقے میں لے لیا۔ اس طرح یہ سب غار کے پاس جا پہنچے۔ جیسے ہی ان کی نظر نجمی پر پڑی، یہ لوگ ٹھٹک کر رہ گئے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

گانے والی لڑکی آہستہ آہستہ نجمی کی طرف چلی۔ اس وقت وہ اپنی ناک پر ایک ریشمی رومال رکھے ہوئے تھی۔ باقی لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اس موقع پر نجمی نے دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں سب سے زیادہ دبلی تھی۔ وہ چہرے مہرے اور ناک نقشے سے بڑی نازک نظر آرہی تھی۔ بالکل چینی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔

نجمی کے جی میں آئی کہ اس کے پاس جا کھڑا ہو اور اسے اپنی گود میں اٹھا کر بچوں کی طرح کھیلنے لگے، مگر اس خیال سے رک گیا کہ ایسا نہ ہو وہ اور اس کے ساتھی ڈر جائیں۔ اب وہ اسی جگہ ٹھہرا ہوا لڑکی کے خوب صورت چہرے پر نظریں جمائے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کے گول گول ابھرے ہوئے گال اور پیاری پیاری آنکھیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

ادھر وہ لڑکی نجمی کو بڑی حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے اس کا ڈیل ڈول اور وضع قطع بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

نجمی اسے دیکھ کر مسکرایا اور لڑکی کو مسکراتے دیکھا تو خوشی سے اور زیادہ کھل گیا۔

اس وقت یہ سب ابھی اپنی ناک پر اپنے رومال رکھے ہوئے تھے۔ نجمی کی ناک میں مشک سے بھی زیادہ تیز خوش بوئیں آرہی تھیں۔ اتنے میں وہ لڑکی نجمی کے قریب آ پہنچی اور اس نے اپنا ہاتھ نجمی کے گھٹنے کی طرف بڑھایا، مگر فوراً ہٹا بھی لیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اسے نجمی کا لباس

بہت عجیب اور کھردرا محسوس ہوا تو یہی حرکت اوروں نے بھی کی۔

جب ان لوگوں نے دیکھا کہ نجمی بُت بنا چپ کھڑا ہے، نہ کچھ بولتا ہے نہ کوئی نقصان پہنچاتا ہے تو ان کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اس وقت لمبی داڑھی والا بوڑھا تیزی سے اپنی جگہ سے اچھل کر نجمی والی چٹان پر جا پہنچا اور نجمی کے سر کے اعضاء ناک، کان، مُنہ وغیرہ غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے کُرتے بھی خصوصیت سے چھو کر دیکھے۔ یہ دیکھ کر لڑکی نے چلّا کر کہا: "جناب حکیم ارمنا صاحب اتنی سوجھ بوجھ کی تکلیف نہ اٹھائیے۔"

اب نجمی کو معلوم ہوا کہ یہ شخص کوئی بہت شان دار آدمی ہے، جبھی تو لڑکی اسے اتنی عزت کے ساتھ مخاطب کر رہی ہے۔

"شہزادی میروت صاحبہ، آپ کوئی اندیشہ نہ فرمائیں، سب ٹھیک ہے۔"

اس طرح نجم الدین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ خوب صورت لڑکی کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں، بلکہ شہزادی ہے۔ نجمی آہستہ سے اٹھا اور شہزادی کے قریب ہو کر تعظیم کے لیے جھکا، پھر ادب کے ساتھ یہ بات کہی: "میں عالی مرتبت شہزادی کی خدمت میں ادب اور احترام کا جذبہ پیش کرتا ہوں اور ان کے حسن و جمال کو خراجِ تحسین ادا کرتا ہوں۔"

شہزادی میروت یہ سن کر شرارت کے انداز سے مسکرائی اور خوشی سے تالیاں بجانے لگی، پھر یہ دو شعر گائے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی آواز میں آواز ملائی

نہ دیکھا تھا کبھی، اے آدمی پہلے یہاں تجھکو — تری تقدیر لے کر آ گئی آخر کہاں تجھکو
نہ میرے ملک کا تو ہے نہ میری قوم کا تو ہے — سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ہے کون اور کیا تو ہے

یہ شعر گا کر وہ دوبارہ ہنسی اور پھر تالیاں بجانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اور سب لوگ بھی ٹھٹھے مار مار کر ہنسنے لگے۔ حکیم ارمنا کو تو اتنی شدت سے ہنسی آئی کہ اس کے ساتھ اس کی لمبی داڑھی بھی سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی۔

اب نجم الدین بھی کسی طرح اپنی ہنسی نہ روک سکا اور بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسنے لگا، مگر وہ لوگ اس کی آواز سن کر ڈر گئے اور انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ حکیم ارمنا صاحب بھی تیزی سے زمین کی طرف جھپٹے اور خود اپنی داڑھی میں الجھ کر چٹان سے گرنے لگے، مگر ان کے دو ساتھیوں نے فوراً انھیں سہارا دے کر سنبھالا اور گرنے سے بچا لیا۔

نجمی حکیم صاحب کی طرف بڑھا اور انھیں اپنے بازوؤں میں لے کر اونچا اٹھایا اور ان کا منہ

اپنے منہ کے برابر لا کر کہا:

"آپ بڑے ظریف ہیں جناب حکیم صاحب!"

ارمنا نے سنجیدہ بن کر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا:

"مگر جناب، یہ کوئی اچھی بات نہیں کی آپ نے۔"

نجمی نے سب کے قہقہوں کی گونج میں حکیم صاحب کو زمین پر رکھ دیا اور کہا، "معاف فرمائیے جناب حکیم صاحب!"

شہزادی میروت نجمی کے قریب آ گئی اور مہین اور نازک آواز میں بولی:

"کیا آپ یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ کون ہیں؟"

نجمی نے ادب سے جھک کر جواب دیا، "میں ہوں آپ کا خادم نجم الدین۔" پھر اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر اس نے یہ شعر گائے:

ننھی منی شہزادی!
کیا خطا مجھ سے ہو گئی ایسی

کیوں خفا ہوتی ہو غریب سے تم
خود مصیبت سے جس کے ہوش ہیں گم

اپنی مرضی سے وہ نہیں آیا — دن یہ قسمت نے اس کو دکھلایا
موجیں اس کو ادھر بہا لائیں — سبز و شاداب مل گئی یہ زمیں

پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر یہ شعر سنانے لگا:

اب یہاں میرے نہ پنپے ہیں جنے گگونے — تمھیں تبلاؤ کہ اب آس لگاؤں کس سے
دل سے اور مجھ سے مگر ہوتی ہیں باتیں اکثر — اب تو لے دے کے بس اک تم ہی پہ پڑتی ہے نظر
تم محبت سے جو پیش آؤ تو سب کام بنیں — سکھ میسر ہو یہیں چین سکوں دل کو ملیں

یہ سن کر شہزادی اور اس کے ساتھی ہنسنے لگے اور بجی بھی دوبارہ ہنس پڑا۔ اس مرتبہ پھر ایک شور اٹھا اور لوگوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ حکیم ارمنا صاحب نے اچھل کر بجی کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔ اتنے میں شہزادی بیروت بجی سے بولی: "بجی، تمھارا آنا کہاں سے ہوا؟"

اب بجی نے اپنے سفر کا پورا واقعہ شروع سے آخر تک بیان کر ڈالا۔ جب تک یہ قصہ ختم نہ ہوا، سب لوگ بڑے غور سے کان لگائے بیٹھے سنتے رہے۔ اور نظروں ہی نظروں میں بجی سے ہمدردی ظاہر کرتے رہے۔

جزیرے کا نام؟

جس وقت شہزادی بیروت اپنے آدمیوں کے ساتھ بجی کا قصہ بڑے غور سے سن رہی تھی اس نے بجی کو آگ کے جزیرے کا واقعہ بیان کرتے بھی سنا اور یہ بھی سنا کہ اس کا نام شیطان کا جزیرہ ہے۔ اس بات سے اس کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ یک بارگی چلا اٹھی:

"اچھا تو وہ ہمارے خوش نما علاقے کو اس نام سے پکارتے تھے!"

بجی نے جواب دیا، "اگر انھیں حقیقت معلوم ہوتی تو یہ ماننے پر مجبور ہوتے کہ اس سے زیادہ خوش نما اور پاکیزہ مقام کوئی نہیں۔ پھر وہ تو اس کا نام فرشتوں کا جزیرہ رکھتے۔"

اس پر حکیم ارمنا نے کہا، "اگر وہ ایسا کرتے تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوتا؟" بجی نے جواب دیا۔

"ہاں یہ ایک اچھا نام ہے۔"

ارمنا تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر بولا، "مگر جو نام انھوں نے رکھ چھوڑا ہے، اس سے ہمیں نقصان بھی کیا پہنچتا ہے؟"

بجی نے کہا، "بات یہ ہے کہ آپ کا ملک بہت حسین ہے۔ اس کے سنگ ریزے نہیں جواہرات ہیں، مٹی نہیں سونا ہے۔"

ارمنا پھر بول اٹھا، "مگر نام میں کیا دھرا ہے جو آپ اس پر اتنا زور دیتے ہیں؟"

بجی سے ضبط نہ ہو سکا اور آخر وہ کہنے لگا، "مجھے تو جناب حکیم صاحب یہ کچھ پسند نہیں آتا کہ آپ کو شیطان کے نام سے پکاروں۔"

ارمنا اس بات سے کچھ ناراض نہیں ہوا اور اس نے اطمینان سے جواب دیا، "کوئی بات نہیں تم چاہو تو اسی نام سے مخاطب کر سکتے ہو۔"

اب بجی نے کہا، "اگر اس جزیرے کا یہ نام نہ ہوتا تو میرا رفیق ابوالحسن حاجی خلیفہ ضرور میرے ساتھ یہاں آتا۔"

اب تو حکیم صاحب غصہ ہو کر بولے، "ہم یہ بالکل نہیں چاہتے کہ کوئی شخص بھی ادھر کا رخ کرے۔"

بجی نے جواب دیا، "اور اسی قسم کی بات کو ہمارے ہاں نفرت اور تعصب کہا جاتا ہے۔"

یہ سنتے ہی ہر طرف سے سب کی آوازیں اٹھیں اور وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے، "معلوم ہوتا ہے چمکیلے کنکروں سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔"

اس بات سے بجی کو تھوڑی سی شرم محسوس ہوئی اور اس نے بات کا رخ بدلنا چاہا، "مگر اس جزیرے کا نام تو مجھے اب بھی نہ معلوم ہوا۔"

اب تو حکیم ارمنا صاحب چلا کر بولے، "کیا نام سے تمھاری واقفیت کچھ بڑھ جائے گی۔ اس پر تمھیں اصرار کیوں ہے؟"

اس وقت بجی نے ندامت کے ساتھ یہ

بھی محسوس کیا کہ حکیم صاحب ہمیشہ سچی بات کہتا ہے۔ واقعی جب وہ اپنی آنکھوں سے جزیرے کو دیکھ چکا ہے تو فقط نام معلوم کرکے اس کی واقفیت میں ایسا کون سا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ سوچتے سوچتے اُسے ایک ایسی بات سوجھی جس کی طرف پہلے اس کا دھیان نہ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیالات ابھرنے لگے: کہیں یہی جزیرہ جزیرۂ سلیمان نہ ہو۔ یہ وہی جزیرہ تو نہیں جس میں حسن نامی بصری سنار ایک مدت پہلے داخل ہوا تھا۔ ہو نہ ہو یہ وہی جزیرہ ہے جس کا عجیب قصہ سونے کی روشنائی سے اس کتاب میں لکھا ہوا تھا اور جسے حاجی خلیفہ اپنے ساتھ جہاز میں لایا تھا۔ اسی کے رنگ ریتوں میں ہیرے، یاقوت اور موتی بکھرے پڑے ہیں۔ اس نے جس طرح گھاس پھوس اگلنے والی مٹی کے نیچے سونے کے ذرّے دیکھے تھے، ہیرے اور موتی وغیرہ بھی ضرور دیکھے ہوں گے۔

بجی کے دل میں اسی طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ قسمت کے الٹ پھیر بھی انسان کے ساتھ کیسا کیسا مذاق کرتے رہتے ہیں اور کیا کیا تماشے دکھاتے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے تو یہ سفر اس ارادے سے شروع کیا تھا کہ اپنا گھر بار اور مال و دولت سب چھوڑ کر کسی طرح جزیرۂ سلیمان میں جا پہنچے اور جب وہ اس جزیرے کے کنارے پہنچا تو لوگوں نے اس کا جو نام رکھ چھوڑا تھا، اسے سنتے ہی خوف کے مارے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ انسان کا یہی حال ہے۔ اس کے بہت سے مقصد اس کے قبضے میں ہوتے ہیں اور وہ اس سے بے خبر رہتا ہے اور جب یہ موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو پھر الٹی ناموں کے سہارے، جو لوگوں کی عقلوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں، ان کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے۔

میروت بجی کو فکر میں ڈوبا ہوا دیکھ کر بولی، "تمھیں کون سا غم ستا رہا ہے بجی؟"

بجی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا، "کیا یہی مقام جزیرۂ سلیمان نہیں ہے؟"

میروت نے سخت دہشت کی حالت میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور پہلے حکیم ارمنا کی طرف اور پھر اور ساتھیوں کی طرف مڑ کر بجی سے کہا، "یہ کس نے کہا تم سے؟"

بجی نے جواب دیا، "مجھ سے تو کسی نے کچھ نہیں کہا، اب آپ ہی اے عالی مرتبہ شہزادی مجھے بتا دیں کہ کیا یہ جزیرۂ سلیمان نہیں ہے؟"

شہزادی میروت بولی، "بجی، تم بڑے اچھے جوان ہو۔ میں تمھیں اپنے اس ملک میں پا کر بہت خوش ہوں، مگر یہ تم ناموں کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ ہمیں یہ بات پسند نہیں۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ہم اس زمین میں پیدا ہوئے اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے یہاں جنم لیا۔ ہمیں ان

کے سوا اس کا کوئی نام معلوم نہیں کہ ہم اسے "اپنی زمین" کہتے ہیں۔" پھر اس نے اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی اور قدرے رک کر کہا، "سنو اے بھائیو، سنو اے قوم سفروت کے سپوتو! یہ نجم الدین اب سے میرا بھائی ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہو جانی چاہیے۔" شہزادی کی یہ بات سن کر سب بڑے خلوص کے ساتھ زمین کی طرف جھک گئے اور حکیم ارمنا صاحب تو اتنے جھکے کہ ان کی لمبی داڑھی سانپ کی طرح زمین پر بل کھانے لگی۔ پھر میروت نے بجی سے کہا، "میرے بھائی ہمیں باتوں کے لیے اور بھی وقت ملے گا۔ اب رات زیادہ ہو رہی ہے، ہمیں اپنے گھر چلنا چاہیے۔ میں تمھیں جلدی ابا جان اور امی جان سے ملانا چاہتی ہوں۔ صبح ہونے کو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ابا جان میرے گھر میں نہ ہونے سے پریشان ہو رہے ہوں۔"

اب وہ پہاڑ کے دامن کی طرف چلی۔ اس کے ایک طرف بجی میروت کی انگلیاں پکڑے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میروت چٹانوں پر تیزی سے اچھلتی کودتی جا رہی تھی۔ اور بجی یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ وہ اتنی تیزی سے چل رہی ہے جتنی تیزی سے چڑیاں شاخوں کے درمیان پھدکتی پھرتی ہیں۔

شہزادی کے باقی ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بجی کوشش کر رہا تھا کہ میروت سے پیچھے نہ رہ جائے۔ بچارا اس کوشش میں

ٹھٹک کر ہانپ رہا تھا پھر بھی پھسل جانے کے ڈر سے چٹانوں پر قدم قدم جما جما کر رکھ رہا تھا۔

میروت تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ٹھہر جاتی تھی کہ جب نجمی کی تھکن بہت بڑھ جائے تو ذرا سستا لے۔ وہ اسی دوران میں ان حوضوں میں سے جو راستے میں چٹانوں میں ملتے، خوب صورت سیپ پھول توڑ لاتی جاتی اور نجمی کو دے دیتی۔ وہ انھیں سونگھتا تو ان کی خوشبو اسے بہت زیادہ پسند آتی۔ وہ شہزادی کا شکریہ ادا کرتا اور پھول اپنے عمامے میں اٹکا لیتا۔ وہ اسی طرح اس دشوار سفر کو طے کرتا جا رہا تھا اور اسے اس کا یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی اپنے قدموں پر چل رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دنیا اس کے لیے الکل نئی تھی اور پہلے کبھی بھولے سے بھی اس کا خیال نہ آیا تھا کہ وہ انھی آنکھوں سے ایسی عجیب عجیب چیزیں دیکھے گا۔

بہن بھائی

جزیرے کا بادشاہ "سومو" اپنی بیٹی میروت سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ وہ جب کبھی چاندنی راتوں میں جزیرے کے اطراف میں گھومنے پھرنے جاتی، تو بادشاہ پہاڑی کے دامن والے محل کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور شہزادی کا انتظار کرتا رہتا۔

یہ شاہی محل پہاڑی کی چوٹی پر تھا جہاں سے دریا نظر آتا تھا اور ایک بڑے وسیع اور کشادہ غار کے اندر بنا ہوا تھا۔ اس طرف کے انجینیروں نے صدیوں پہلے یہ جگہ جزیرے کے بادشاہوں کے لیے چنی تھی۔ اس لیے کہ یہ شمالی ہواؤں کے زور سے محفوظ تھی جیسے سورج کی شعاعوں کا یہاں کوئی گزر نہ تھا۔

یہ پرانا محل جزیرے کے بڑے بوڑھوں نے چٹانوں کے بیچ چیر چیر کر تراشا تھا۔ بڑے بڑے انجینیر اور کاریگر اس محل کی خوش نمائی اور خوب صورتی کے لیے محنت کرتے چلے آئے تھے۔ پورا محل نہایت خوش نما اور رنگ برنگ کی شفاف چٹانوں سے بنا ہوا تھا۔ اس میں لکڑی یا لوہے وغیرہ کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس کے ستون اتنے شفاف تھے کہ ہر وقت جگمگاتے نظر آتے تھے۔ یہی حال میزوں، کرسیوں اور دوسری چیزوں کا تھا۔ یہ بھی اپنی چمک دمک سے انسان کی نگاہوں کو چندھیائے دیتی تھیں۔

جب شہزادی میروت اپنے ساتھیوں کے جھرمٹ میں محل کے دروازے پر پہنچی تو باپ کو بہت پریشان دیکھ کر گھبرا گئی۔ بادشاہ نے کئی زینے اتر کر اس کی پیشوائی کی اور چہرہ کراے گلے لگایا۔ مگر جب نجمی کو دیکھا تو ٹھٹک کر بیٹی اور حکیم الدنیا پر غصے کی نظر ڈالی۔ یہ دیکھ کر شہزادی نے جلدی سے کہا، "ابا جان، یہ میرے بھائی ہیں نجم الدین۔"

پھر نجمی سے آگے بڑھی اور یہ کہتے ہوئے ابا جان کی گردن میں بانہیں ڈال دیں:
"میں نے انھیں ساتھ چلنے کا حکم دیا ہے۔ میں ہی اپنی حفاظت میں یہاں لائی ہوں ابا جان!"

بادشاہ نے بیٹی کو محبت سے سینے سے لگایا، پھر مسکرا کر نجمی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

نجمی آگے بڑھا اور ادب کے ساتھ جھکتے ہوئے بولا "اللہ حضور کو ہمیشہ سلامت رکھے اور آپ کے ملک کی حفاظت فرمائے۔ میں آپ کا سچا خادم ہوں۔"

قد تو جزیرے کے بادشاہ کا بھی بیٹی ہی کے قد کی طرح تھا، مگر عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بدن موٹا ہو گیا تھا اور شکل صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ سلامت نے زمانہ بہت دیکھا ہے اور بہت سے حادثوں اور مصیبتوں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کا چہرہ کھنچا ہوا اور ڈاڑھی سفید اور چھوٹی تھی جو ان کی کمر تک پہنچتی تھی۔ لوگوں کی نظریں بادشاہ پر پڑتیں تو رعب سے جھک جاتیں۔ نجمی نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ جزیرے کی رعایا بادشاہ کا حد سے زیادہ ادب کرتی تھی۔ لوگ ان کے چہرے

کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔

اس موقع پر بادشاہ نے ملاقات کو زیادہ طول نہ دیا اور محل کے اندر بڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر اور لوگ بھی ادب سے آگے بڑھے۔ نجمی بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ اس وقت شہزادی میروت نے نجمی کی طرف مڑ کر کہا، "ہمارے ساتھ آؤ نجم الدین!"

اب نجمی میروت کے پیچھے ہو لیا اور دوسرے لوگ مختلف سمتوں میں ادھر ادھر چلے گئے۔ صرف ارمنا رہ گیا جو بادشاہ کے ایک طرف خاموشی سے چلتا رہا۔ جب بادشاہ محل میں پہنچا تو بلور کی ایک بڑی کرسی پر بیٹھ گیا پھر نجمی کی طرف مڑ کر اس سے کہا، "تم پہلے آدم زاد ہو جو اس علاقے میں داخل ہوا ہے۔"

نجمی آداب بجا لایا اور بولا، "میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جہاں پناہ!"

بادشاہ نے جوش کے لہجے میں کہا، "میں چاہتا ہوں تم مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرو۔"

نجمی نے جلدی سے جواب دیا، "میں وعدہ کرتا ہوں اے میرے آقا!"

بادشاہ نے اپنا سر ہلایا اور شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے اس انداز سے بات کی جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو، "انسانوں کی عادت ہے۔ وہ اسی طرح وعدہ کرتے وقت جلدی سے کام لیتے ہیں۔" اس وقت ارمنا حکیم نے دبی دبی آواز سے کہا، "اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جلد ہی وعدے کی ذمہ داری سے آزاد ہو جائیں گے۔"

نجمی شرمندہ ہو گیا اور اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ میروت نے دیکھا کہ موقع بہت نازک ہے۔ اس لیے وہ باپ کی طرف جھک کر بولی، "وہ آپ کی اطاعت پر رضامندی ظاہر کر رہا ہے ابا جان!"

بادشاہ مسکرایا اور نجمی کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا، "مجھ سے ناراض نہ ہو اے نوجوان، میں تم پر ملامت نہیں کر رہا ہوں۔"

نجمی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس نے کہا، "دل سے ممنون ہوں حضور والا کا۔"

تھوڑی دیر ٹھہر کر بادشاہ نے کہا، "مجھے تم سے امید ہے نجم الدین!"

نجمی نے عرض کی، "جو حکم ہو جہاں پناہ، دل و جان سے بجا لاؤں گا۔"

اس مرتبہ پھر بادشاہ کے چہرے پر شک کے آثار ظاہر ہوئے اور کہا، "جب تم سے ہو سکے نجم الدین، جب تم سے ہو سکے۔ میں انسان کی طبیعت سے واقف ہوں اس لیے تم سے اتنی ہی فرمائش کرتا ہوں کہ تم میرا کہا ماننے کی کوشش ضرور کرنا۔" یہ کہتے کہتے بادشاہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا، "جب تم کسی دن اس پرندے کو دیکھو اور وہ کچھ کہے تو اس کی بات نہ ماننا۔"

نجم الدین کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ پھر بھی اس نے جوش بھرے لہجے میں

کہا، "میں اپنی عزت کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں میرے آقا کہ میں اس پرندے کا حکم ہرگز نہ مانوں گا اور اگر ضرورت پیش آئی تو اسے خود اپنے ہاتھ سے مار ڈالوں گا۔"

اس وقت حکیم صاحب غصیلی آواز میں بولے، "ہم پرندہ مار ڈالنے والی بات بالکل نہیں جانتے نوجوان۔"

ادھر بادشاہ نے کہا، "اور تم اس کی جان لے بھی نہیں سکتے۔"

اس وقت میروت نے پھر چلا کر کہا، "مجھے یقین ہے ابا جان! وہ اس کل مُنہے پرندے کی بات ہرگز نہ مانے گا۔"

بادشاہ نے پہلے شہزادی پر نظر ڈالی پھر نجم الدین کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد خاموشی سے محل کے اندر چلا گیا اور حکیم ارمنا صاحب کو ساتھ آنے کی ہدایت دی۔

شہزادی محل کے ایک اور حصے کی طرف ہو لی اور نجم الدین کو بھی ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ نجمی جیسے جیسے محل کے اندر بڑھتا اور وہاں کی چیزوں پر نظر ڈالتا، ویسے ویسے اس کا تعجب بڑھتا جاتا۔ اب وہ ایک بڑے ہال میں سے ہو کر گزر رہا تھا جس میں کئی کھلی ہوئی شہ نشینیں تھیں۔ ان کے درمیان بلوری ستون تھے۔ ان کی چھتیں کم ہلکے رنگ کی سی زرد تھیں۔ محل کے اس حصے میں جتنا سامان بھی تھا، وہ خوش نما رنگوں کے پتھروں سے تیار کیا ہوا تھا۔ ان میں جا بجا نفیس شکلیں تراشی گئی تھیں۔ ہر کمرے کے دونوں طرف کٹی کٹی مورتیں تھیں جن میں بعض حیوانوں کی تھیں اور بعض قوم سفروت کے اشخاص کی۔ انھیں قدرتی رنگوں سے ایسی خوبی سے رنگا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر پڑتی تو وہ اس سوچ میں پڑ جاتا کہ ان مورتوں میں کہیں جان تو نہیں ہے جو ایسی نظر آ رہی ہیں جیسے سانس لے رہی ہوں اور چل پھر رہی ہوں۔

جب میروت محل کے آخری حصے میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ وہاں نوکروں کی ایک جماعت پیشوائی کے لیے موجود ہے۔ یہ لوگ تعظیم کے لیے جھک گئے۔ میروت نے ان میں سے بعض کو حکم دیا کہ نجم الدین کو حمام لے جائیں۔ پھر نجمی کی طرف دیکھ کر بولی، "میں اپنے ابا جان کے ساتھ تمھارا انتظار کروں گی۔"

نجمی خادموں کے ساتھ ہو لیا جو اسے ایک شیشے کے راستے سے ایک بڑے وسیع کمرے میں لے گئے۔ اس کمرے میں بڑی تیز روشنیاں سبز رنگ کے شعلوں سے نکل رہی تھیں۔ کمرے کے آخر میں ایک حوض تھا جس میں چٹان کے اندر سے پھوٹنے والے چشموں سے پانی گر رہا تھا۔ نوکروں نے ایک چٹانی کرسی پر تکیوں اور تولیوں کا بنڈل رکھ دیا اور خود کمرے سے نکل گئے۔

کئی دن کے سفر نے نجمی کے کپڑے بہت میلے کر دیے تھے۔ اس نے کپڑے اتارے اور پانی کے حوض پر گیا۔ پانی کو چھوا تو نیم گرم پایا۔ حوض میں اترا تو اسے عجیب طرح کی پاکیزہ خوشبو آنے لگی جو زرد رنگ کے

لطیف دھوئیں کی شکل میں ابھرتی نظر آ رہی تھی پھر جب اپنا بدن اس میں ڈبویا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے قوت کی ایک لہر اس کے جسم کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کو تحلیل کر رہی ہے۔ اس وقت نجی کو اپنے بدن میں ایک نئی زندگی دوڑتی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح بدل رہی ہے اور اس کے اندر ایک قسم کا ابھار اور بلندی پیدا ہو گئی ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ نہا دھو کر وہ پانی سے نکلا تو کپڑوں کا بنڈل کھول کر لنگیاں اور چادریں اس انداز سے بدن میں لپیٹ لیں جیسے حج کرنے والے احرام باندھتے وقت لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ یہ چیزیں ریشم کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نرم و نازک اور تازہ محسوس ہوتی تھیں۔

تمام کے کمرے سے نکلا تو اس کمرے میں نوکروں کو اپنا منتظر پایا۔ انھوں نے ایک تخت کی طرف اشارہ کیا جس پر طرح طرح کے کپڑے رکھے ہوئے تھے اور خود وہ اسے اکیلا چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔

اب اس نے وہ کپڑے اٹھا کر دیکھے تو اسے تعجب ہوا کہ ان کی وضع قطع قوم سفروت کے کپڑوں کی سی تھی۔ اگرچہ اس نے ان لوگوں میں سے کسی میں اپنی جیسی وضع نہیں دیکھی تھی۔ وہ انھیں پہن کر بہت خوش ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ آئینہ ہوتا تو اس میں اپنی صورت دیکھتا۔

ان کپڑوں سے ایسی کا بھی خوش ہوا۔ یہی تھی کہ نجی نے کبھی نہ سوچی تھی۔ میروت نے جو سفید پھول نجی کو دیا تھا اس وقت اسے یاد آیا۔ وہ اسی وقت حمام کے کمرے میں لوٹ کر گیا۔ اپنے کمائے سے وہ پھول نکال کر اپنی ٹوپی میں اٹکا لیا۔ اسے یہ دیکھ کر اور حیرت ہوئی کہ پھول اب بھی ویسا ہی تر و تازہ اور خوشبودار تھا۔

جب نجی سب کپڑے پہن چکا اور کمرے سے باہر نکلا تو قریب کے کمرے میں خادموں کو اس نے اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے پہلے ڈیوڑھی میں پھر اس محل میں لے گئے، جہاں سے وہ پہلے گزر چکا تھا۔ یہاں اسے میروت اور اس کے ساتھ ایک اور بیگم بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔

نجی ان کی طرف بڑھا اور ادب سے جھک گیا۔ میروت نے نجی سے کہا، "یہ ہیں میری امی نجی!"

نجی اپنے گھٹنوں کے بل جھکا اور اس نے ملکہ کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ملکہ اس کی تعظیم سے بہت خوش ہوئی اور اس سے کہا، "اب تم میرے بیٹے بن چکے ہو۔"

نجی دوبارہ تعظیم کے لیے جھکا اور کہا، "میں بڑا خوش نصیب ہوں ملکۂ عالم کہ مجھے آپ کی محبت کا شرف حاصل ہے۔"

اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے میروت سچ مچ اس کی چھوٹی بہن ہے اور جب سے پیدا ہوئی ہے اس کے

ساتھ رہتی ہے۔ اس نے میروت کی طرف مڑ کر کہا، "پیاری بہن، میں تمھارا بہت شکر گزار ہوں۔"

میروت ہنس کر بولی، "کیا تمھیں یہ کپڑے پسند ہیں؟"

اب نجی نے اپنے آپ کو دیکھا اور کپڑے کی آستینوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا، "یہ بھی میری خوش نصیبی ہے کہ یہاں اس ناپ کا لباس موجود ہے۔"

میروت ہنستے ہوئے بولی، "اب سے گھنٹہ بھر پہلے تو نہ تھا۔"

اب تو نجی کی حیرانی بڑھی اور اس نے کہا، "یہ اور بھی عجیب بات ہے۔"

اس وقت ملکہ بول اٹھیں، "تمھیں اس بات سے تعجب کیوں ہوا؟ ایک کاری گر گیا اور انھیں بنا لایا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

نجی بولا، "پھر تو وہ بے شبہ بڑا ماہر درزی ہے۔"

میروت ضبط نہ کر سکی اور زور سے ہنس پڑی: "درزی سے کیا مطلب نجی؟ یہ لباس تو فقط گندھا ہوا آتا ہے۔ جیسے سانچوں میں ڈھال لیا گیا ہے اور سانچے تو جیسے چاہو بنائے جا سکتے ہیں۔"

نجی نے میروت کی طرف مسکرا کر دیکھا اور دل میں سمجھا کہ وہ اس سے مذاق کر رہی ہے، لیکن جب اس نے آستین آنکھوں کی طرف بڑھا کر سلائی کا اثر دیکھنا چاہا تو اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ اس وقت اسے بات بڑھانا مناسب نہ معلوم ہوا کہ ان چیزوں پہ اور زیادہ حیرت ظاہر کرے۔ اس لیے میروت سے کہا، "پیاری ملکہ واقعی

یہ کپڑے بہت نفیس ہیں۔"

میروت جلدی سے بولی۔ "مجھے میری مالکہ نہیں، "میری بہن" یا "اے میروت" کہا کرو۔"

نجمی مسکرا کر بولا، "میں تمھارا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں پیاری بہن۔"

اس کے منھ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور دل محبت سے امڈا چلا آ رہا تھا۔ ایسی محبت سے جیسی اس سے پہلے کسی سے محسوس نہ ہوئی تھی۔ میروت کی امی ہنس پڑیں اور بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا، "میں سمجھتی ہوں نجمی کو سونے سے پہلے کھانے کی ضرورت ہوگی۔ اب یہ تمھارا کام ہے میروت کہ اپنے بھائی کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھو۔" پھر وہ مسکرائی اور نجمی کی طرف دیکھا۔

نوجوان لڑکا آداب بجا لایا اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بولا، "اللہ کی امان میں اے میری مالکہ!"

اب ملکہ نے اپنے کمرے کا راستہ لیا اور میروت اور نجمی ایک اور کمرے میں چلے گئے، جہاں گلابی پتھر سے تراشی ہوئی میز لگی تھی۔ اس میز پر بلور کی طشتریوں میں رنگ برنگے نفیس کھانے سجے ہوئے تھے۔ میروت نے دسترخوان کی طرف اشارہ کرکے کہا، "یہ ہے تمھارا کھانا نجمی اور میں تو پہلے ہی کھا چکی ہوں، اس لیے دیر نہ کرو اور بسم اللہ کرو۔"

واقعی نجمی کو اس وقت انتظار کی تاب نہ تھی۔ اس کو صبح سے اب تک صرف ایک ٹکڑا ناریل کا کھانے کو نصیب ہوا۔ وہ بے تکلف ایک گلابی رنگ کی کرسی پر بیٹھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔

اتنا مزے دار کھانا نجمی نے زندگی بھر میں کبھی نہ کھایا تھا۔ یہ بغداد یا کسی اور جگہ کے کھانوں سے بالکل مشابہ نہ تھا۔ وہ نہ گوشت تھا، نہ سبزی نہ پھل۔ پھر ان تینوں قسم کے کھانوں سے زیادہ مزے دار اور خوش گوار معلوم ہوتا تھا۔ اس کھانے کی مہک عطر سے بھی زیادہ خوش بودار تھی۔

نجمی کھانا کھا چکا تو اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ شہزادی قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ نجمی کو اس نے ایک بار اونگھتے ہوئے دیکھا تو باتیں کرتے کرتے اٹھ بیٹھی اور نجمی سے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت چاہی۔ ادھر وہ رخصت ہوئی، ادھر نجمی اپنے کمرے میں داخل ہوا جو اس کی بہن نے سجا رکھا تھا۔ وہ اب ایک صاف ستھری نیلے رنگ کی مسہری پر لیٹ گیا اور اسی رنگ کی چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ کر گہری نیند کے مزے لینے لگا۔ اس وقت جو سویا تو دوسری شام تک پڑا سوتا ہی رہا۔ اٹھ کر ضروری کاموں سے فارغ ہوا پھر جب میروت کے ساتھ ٹہلنے نکلا تو چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور جزیرے کے چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی عجب سماں دکھا رہی تھی۔

جزیرے کی سیر

نجم الدین کو اس جزیرے میں کئی مہینے گزر گئے اور اسے دن گزرنے کا کوئی احساس نہ ہوا۔ منھ بولی بہن

میروت سے اس کا دل خوب لگ گیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لیے لیے پھرتی اور اسے جزیرے کے ایسے ایسے عجائبات دکھاتی جو انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہوں گے۔ وہ سمندر کے کناروں پر اور ہری بھری پہاڑیوں میں جا بجا نجمی کی تفریح کا سامان کرتی رہتی۔ چاندنی راتیں ہوتیں تو راتوں کے جلسوں کا انتظام کرتی۔ کبھی کبھی کاری گروں کی بنائی ہوئی خوش نما اور نفیس کشتیوں میں ہوا بھرے ہوئے بادبان لگے ہوتے تھے اور یہ پانی کی لہروں پر ہوا کے سہارے بڑی نزاکت سے چلتی رہتی تھیں۔ ماہر کاری گروں کی بنائی ہوئی کلیں ان کو تیزی سے حرکت دیتی تھیں اور کشتیوں میں سیر کرنے والے دریا کی سیر کا پورا لطف اٹھایا کرتے تھے

کبھی کبھی شہزادی میروت اپنے کپڑوں سمیت دریا میں اتر جاتی۔ ان کپڑوں میں پانی نہ گھستا تھا اور وہ دریا کی گہرائیوں میں بہت دیر تک غوطے لگاتی رہتی پھر سطح پر آتی تو طرح طرح کی سیپیاں اور موتی اس کے پاس ہوتے۔

بات یہ ہے کہ میروت اور اس

کی قوم کے سب لوگ پانی کے نیچے بھی اسی طرح آسانی سے رہ سکتے تھے جس طرح زمین کے اوپر رہا کرتے تھے۔

ان لوگوں میں سال میں ایک موسم ایسا بھی آیا کرتا تھا جس میں ان کی پوری قوم پانی کے نیچے اتر جاتی اور وہاں کئی مہینے گزارتی۔ جب گرمی کا موسم زور و شور سے شروع ہو جاتا تو یہ لوگ پھر اوپر آجاتے اور معمول کے مطابق رہنے سہنے لگتے۔ اس مدت میں نجمی نے جزیرے کے عالموں اور بڑے بڑے کاریگروں سے کئی فن سیکھ لیے۔ وہ اپنی اس مہارت کے ذریعے سے ان لوگوں سے ملا کرتا اور ان کے یہاں بھی جاتا۔ یہ لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اپنے یہاں کے خاص بھید اسے بتایا کرتے۔

ان لوگوں کی ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ ان کے یہاں کارخانے اور تجربہ گاہیں بڑی کثرت سے تھیں جو پہاڑ کی کھوہوں میں قائم تھیں۔ ان میں وہ ایسی ایسی عجیب چیزیں تیار کرتے تھے جن کو دیکھ کر لوگوں کی عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔

نجمی جب ان میں جاتا تو چھوٹے چھوٹے قد والے لوگوں کو دیکھتا کہ وہ مل جل کر شہد کی مکھیوں کی طرح کام کرتے ہیں اور چیونٹیوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ کانوں سے نکلی ہوئی دھاتوں کو گلا دیا کرتے اور ان سے نہایت نازک قسم کی کلیں اور پرزے بناتے رہتے۔ ساتھ ہی تحقیقات کا کام بھی جاری رہتا تاکہ قدرت کے جو بھید ان سے چھپے رہ گئے ہیں، ان پر کھلتے رہیں۔

وہ اپنا کچھ وقت حکیم ارنا صاحب کے ساتھ بھی گزارا کرتا۔ ایک بار حکیم صاحب نے اسے تجربہ خانے میں آنے کی دعوت دی۔ نجمی گیا تو اس نے حکیم صاحب کے دوستوں کی ایک جماعت وہاں دیکھی جو "مقدس آگ کے پجاری" کہلاتے تھے۔ یہ سب لوگ بڑے اونچے درجے کے عالم تھے اور قوم سفروت میں ان کی بڑی عزت تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی کائنات (دنیا) کے راز دریافت کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ زندگی کی گہماگہمی سے الگ تھلگ رہا کرتے تھے۔

حکیم ارنا صاحب نجمی کو بہت سے چھوٹے کمروں میں لے گئے جن میں بے گنتی بے شمار عجیب و غریب کلیں رکھی ہوئی تھیں اور عوام کو ان سے واقف ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہ کلیں مقدس رازوں میں شمار ہوتی تھیں۔ ان سے جس طرح بھلائی کے کام لیے جاتے تھے، برائی کے لیے بھی انھیں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ کلیں تن درستی، قوت اور زندگی بخشتی تھیں اور تباہی، بربادی اور ہلاکت کا سامان بھی بن جاتی تھیں۔ اسی لیے یہ علما ان کا بھید کسی کو نہ بتاتے تھے، تاکہ کوئی انھیں برے مقصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔ یہ پجاری حکما اور علما کی بہت سی نسلوں کے وارث تھے۔ انھوں نے پوشیدہ علوم اپنے باپ دادا سے سیکھے تھے اور ان کا یہ فرض تھا کہ اپنی اولاد سے پکے عہد و پیمان اور سچی خیر خواہی اور وفاداری کا وعدہ لے کر انھیں

ان بھیدوں کی تعلیم دیں۔

ان لوگوں میں یہ عقیدہ پھیلا ہوا تھا کہ مقدس آگ کے سب سے پہلے مجاور (پجاری) سلیمان حکیم تھے جنھوں نے اپنی طاقت سے جنوں اور انسانوں کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ یہ لوگ چٹانیں تراش تراش کر محل بناتے اور ان میں اپنے فن کے بڑے بڑے کمالات ظاہر کرتے تھے۔

نجم الدین کا یقین اس بات پر روز بروز بڑھتا اور پکا ہوتا جاتا تھا کہ یہی جزیرہ جس میں سفروت نامی قوم آباد ہے جزیرۂ سلیمان ہے۔ اسی کا ذکر حسن بصری نے اپنی کتاب میں کیا اور اسی کی تلاش میں حاجی خلیفہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔ اسے جب بھی اپنا غریب دوست یاد آتا، اس کی جدائی کے خیال سے غم گین ہو جاتا اور دل ہی دل میں تمنا کرنے لگتا کہ کاش وہ زندہ ہوتا اور اسے پھر دیکھنے کا موقع نصیب ہوتا کہ وہ اسے اس جزیرے کے حالات سنائے جس کے خواب وہ دیکھا کرتا تھا۔

اس جزیرے کی زندگی زیادہ تر انھیں پجاری عالموں کی کوششوں پر موقوف تھی جو نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے میں لگے رہتے تھے۔ انھیں جتنے بھید بھی معلوم ہوتے سب کو اپنی قوم (سفروت) کی بھلائی کے لیے کام میں لایا کرتے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ بڑے چین آرام سے زندگی بسر کرتے تھے اور انھیں ویسی محنت مشقت نہیں کرنا پڑتی تھی جیسی غریب انسانوں کو کھیتی اور سخت قسم کی مزدوریوں کی صورت میں کرنی ہوتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان عالموں کے دریافت کیے ہوئے بھیدوں نے یہاں کے عوام کو سنگ دلی اور بے رحمی سے بھی بچا رکھا تھا۔ وہ گوشت کھانے کے لیے حیوانوں کی جان نہ لیتے تھے۔ قریب کے سمندر میں رہنے والی مچھلیاں تک بالکل محفوظ تھیں۔ جزیرے کے لوگوں کی کل غذا پھلوں اور سبزیوں سے حاصل ہوتی تھی جو جزیرے کے میدانوں اور پہاڑی وادیوں میں بڑی تیزی سے بڑھتی رہتی تھیں۔ ان پیداواروں میں یہ ترقی سائنس کی مدد سے ایجاد کی ہوئی کلوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ رہیں ان لوگوں کی عجیب پوشاکیں تو جیسا کہ نجم الدین کو پہلے ہی دن معلوم ہو گیا تھا، ایک سائنسی طریقے سے تیار کی ہوئی گلدی سے بنائی جاتی تھیں۔ پہننے والے انھیں جیسے سانچوں میں چاہتے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے۔

انھی سب باتوں کا نتیجہ تھا کہ قوم سفروت کے لوگوں کا تمام وقت مختلف فنون میں ایجادیں کرنے اور زندگی کی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے بچ رہتا اور وہ حرص و ہوس اور سنگ دلی سے پاک صاف زندگی گزارا کرتے۔ انھیں سب سے زیادہ لطف اس پروردگار کی عبادت میں آیا کرتا جس نے یہ تمام عالم اور اس کی تمام پیداوار دنیا میں بسنے والوں کے لیے بنا ڈالی۔ اسی نے زندگی کی سوجھ بوجھ بخشی اور انسان کی عقل کا رخ بھلائی کی طرف پھیرا۔ وہی آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور وہی اپنی

مرضی کے مطابق لوگوں کے دلوں کو جدھر چاہتا ہے، ادھر پھیر دیتا ہے۔

جزیرے کی یہ زندگی نجم الدین پر بھی اثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے بعض فن سیکھنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ تحقیقات کے کاموں میں پوری طرح وہاں کے سائنس والوں کے ساتھ نہ چل سکا۔ اس لیے صرف شفاف چٹانوں سے مورتیاں اور مجسمے بنانے کا کام مہارت کے ساتھ سیکھنے کو غنیمت سمجھا۔ اس کی بہن میرودت نے بہت سے پرندوں، مچھلیوں اور حیوانوں کی فطرت سے اسے واقف کر دیا تھا، تاکہ وہ ان مورتوں میں خاص خاص نازک باتوں کی تصویر اتار سکے۔ وہاں نجمی کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب وہ دیکھتا کہ تمام جان دار ایک دوسرے سے ہل مل کر رہتے ہیں اور اپنے قریب آنے والوں سے نفرت نہیں کرتے، اس لیے کہ ان سب میں جو عام سلامتی پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے یہ سب ایک دوسرے سے مطمئن رہتے ہیں تو اسے بڑی حیرت ہوتی۔ پورے جزیرے میں پھاڑ کھانے والے اور خون پینے والے جانوروں کا دور دور پتا نہ تھا۔ وہاں جتنے بھی جان دار تھے، سب خدا کی پیدا کی ہوئی پیداوار پر آرام سے زندگی بسر کرتے تھے اور کسی کو دکھ نہ دیتے تھے۔ نجم الدین نے اپنے لیے ایک خاص کمرہ لے رکھا تھا، جس میں وہ اپنے مجسمے بنایا کرتا تھا۔ اب وہ پتھروں سے ایسی مورتیں بنا سکتا تھا جنھیں دیکھنے والے اس گمان میں پڑ جاتے کہ یہ مورت زندہ حیوان یا درخت ہے جو ہوا کے جھونکے لیتا نظر آ رہا ہے۔ کام کرتے کرتے جب نجمی کو تھکن محسوس ہونے لگتی تو وہ ایک باجا اٹھا لیتا اور اس پر میرودت سے سیکھے ہوئے بعض راگ بجانے

لگتا۔ اس طرح تھکن دور ہو جاتی اور اسے بڑا سکون محسوس ہونے لگتا۔

کبھی کبھی وہ دھوپ میں نکل پڑتا اور دن میں اکیلا ہی ادھر ادھر گھوما پھرا کرتا۔ قوم میرودت کے لوگ دھوپ میں چلنا پھرنا پسند کرتے تھے۔ اس طرح سیر و تفریح کی صورت میں نجمی کی ورزش ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ پانی میں اتر جاتا اور صاف شفاف پانی میں تیر کر دل بہلایا کرتا۔ کبھی پہاڑ کی بلندی پر جا کر غاروں کے اندر سیر کرتا اور وہاں جو درخت اور بیل نظر آتے، ان کی ترکیبوں پر غور کیا کرتا۔ غاروں میں کہیں کہیں چشمے بھی ملتے جن میں سے بعض کا پانی ٹھنڈا ہوتا اور بعض کا گرم۔

ایک دن جاڑے کے موسم میں میرودت نے نجمی کو دعوت دی کہ آؤ سیر کو چلیں۔ اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، لیکن ہوا بہار کے دنوں کی طرح گرم تھی۔ میرودت اسے لے کر سیدھے دروازے سے نہیں نکلی، بلکہ محل کے پچھلے دروازے کی طرف ہو لی۔ جب یہ دونوں چلتے چلتے ایک کھلے میدان میں پہنچے تو میرودت نے کہا: "آج میں تمھیں بعض نئی چیزیں دکھلاؤں گی۔"

نجمی خوش ہو کر بولا، "اچھی بہن میں تو جب بھی تمھارے ساتھ سیر کو نکلا ہوں ہمیشہ نئی نئی چیزیں دیکھا کرتا ہوں:"

میرودت نے کہا، "شاید تم بھول گئے، تم غلے اور خوراک کے گودام دیکھنا چاہتے تھے۔"

نجمی نے ہنس کر کہا، "شکریہ بہن، تم نے میری یہ بات یاد رکھی۔"

"ہاں، میں نے بھلائی تو نہیں۔" میرودت نے کہا، "لیکن تم کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ میں دن کی روشنی میں سیر نہیں کر سکتی۔"

نجمی نے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں پر نظر ڈالی اور بولا، "ہاں، مجھے ان گوداموں کے دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"

میرودت نے کہا، "میں سمجھتی ہوں، میں نے ان کا جو حال کہا تھا، تم کو ابھی تک اس پر یقین نہیں آیا۔"

نجمی نے جواب میں کہا، "تمھاری بیان کی ہوئی باتیں اگر میری سمجھ میں نہیں آتیں بہن، تو اس پر مجھے ملامت نہ کرو۔ تم ہی کہو، میں ایسی آنکھ کا تصور کیسے کر سکتا ہوں جو زمین کے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی چیز بھی دیکھ سکتی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں کیسے آ سکتی ہے کہ وہاں ایک ایسا خود بھی ہے جسے سر پر رکھنے سے دیکھنے والے لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ ایک ایسا غالیچہ بھی ہو سکتا ہے جو ہوا کے اوپر اڑتا ہے، یا ایسا مصنوعی کان بھی موجود ہے جو دور سے دور ملکوں کی سرگوشی بھی سن سکتا ہے۔ یہ سب باتیں قصوں کہانیوں میں تو مزہ دار پائی جاتی ہیں، لیکن حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔"

میروت مسکرا کر بولی، "اچھا، جب آنکھوں سے دیکھ لو گے تب تو یقین کر لو گے نجمی؟"

"بے شک میری مالکہ۔" نجمی بولا۔

"پھر تم نے مجھے میری مالکہ کہا نجمی؟"

نجمی مسکرایا اور بولا، "بہن، مجھے ملامت نہ کرو۔ ہاں جب میں یہ عجائبات اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا تو ضرور یقین کر لوں گا۔"

میروت نے کہا، "لیکن گوداموں تک پہنچنے سے پہلے میں تمھیں تمھارا ایک وعدہ یاد دلاتی ہوں۔"

اب یہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے ایک باغ میں پہنچ گئے تھے جو ایک وسیع کچھار سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں مختلف پھلوں سے لدے ہوئے بکثرت درخت تھے جن کی قسموں کا کوئی شمار نہ تھا۔

نجمی نے درختوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا، "اور وہ وعدہ کون سا ہے بہن؟"

میروت بولی، "کیا بھول گئے نجمی؟"

نجمی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "مو واقعی میں نے تم سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ افسوس بہن، مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا ہے۔"

میروت مسکرا کر بولی، "مجھ سے نہیں، میرے ابا جان سے وعدہ کیا تھا۔"

نجم الدین حافظے پر زور دیتے ہوئے بولا، "کیا میں نے جہاں پناہ سے کوئی وعدہ کیا تھا؟"

میروت نے کہا، "جس روز تم آئے تھے، کیا اس دن کی بات یاد نہیں رہی؟"

نجمی زور سے بول اٹھا، "ہاں بہن، مجھے خیال ہے۔ انھوں نے کسی کالی چیز کا ذکر کیا تھا، انھوں نے ایک کالے پرندے کے لیے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس کی بات نہ مانوں۔ ٹھیک ہے، اگر جب اسے دیکھوں گا تو اسے مار ڈالوں گا۔"

میروت ہنستے ہوئے کہنے لگی، "تمھاری یاد بہت کمزور ہے۔ تم تو یہ بھی بھول گئے کہ ہم لوگ اس جزیرے میں کسی حیوان کو جان سے نہیں مارتے۔"

نجمی نے کہا، "جو تمھیں ستائے، اسے بھی نہیں مارتیں؟"

میروت بولی، "ہم بغیر جان لیے تکلیف کو دور کر دیا کرتے ہیں۔ مجھے خیال ہے کہ تم نے ابا جان سے وعدہ کرنے میں جلدی سے کام لیا تھا۔"

"ہاں، مجھے جہاں پناہ سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ میں

ایک پرندے کا کہا کیسے مان لیتا؟ کیا پرندے بھی کوئی حکم دے سکتے ہیں؟"

میروت نے کہا، "ہاں، اب تمھیں یاد آ گیا۔ دیکھنے میں تو وہ ایک کالا پرندہ ہے، لیکن اصل میں وہ جنوں کا ایک بادشاہ ہے۔ وہ قوم سفروت کا اور میرے والد کا دشمن ہے۔ جب اس کی نظر تم پر پڑے گی تو وہ ضرور تمھارے خیالات خراب کرے گا۔"

نجمی ہنس کر بولا، "ایک پرندہ مجھے کیا ورغلائے گا، خواہ وہ جن ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ میرے دل میں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرے گا، میں اس کی بات ہرگز نہ مانوں گا۔"

اب یہ دونوں سبز درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے جن کے پھل لٹک رہے تھے اور ان کی پاکیزہ خوشبو مہک رہی تھی۔ نجمی پھل توڑ توڑ کر چکھنے لگا۔ نہروں کے پانی سے ہاتھ دھوتا جاتا اور ان کا پانی پی لیتا جو بہت مزے دار اور صاف شفاف تھا۔ جب کوئی پھل اسے بہت اچھا لگتا تو میروت سے اس کا نام پوچھتا اور وہ ہنس کر کہتی، "کیا نام سن کر اس کی پہچان اور بڑھ جائے گی نجمی؟"

نجمی نے کہا، "میں ان کے نام ایک خاص خیال سے پوچھا کرتا ہوں۔"

میروت بولی، "شاید تم ان کی تجارت کرنا چاہتے ہو۔"

نجمی نے کہا، "مجھے اس کی طمع نہیں ہے۔ کیوں کہ قوم سفروت کے لوگ پھل نہیں خریدتے۔ "وہ پھل کیوں خریدیں جب کہ وہ جتنے پھل چاہیں خود ہی لے سکتے ہیں۔"

نجمی نے کہا، "مگر میں نے کسی کو انھیں کھاتے نہیں دیکھا"

میروت ہنس پڑی اور بولی، "کیا کسی کو کھاتے نہیں دیکھا اور آج خود تم نے کیا کھایا تھا؟"

نجمی نے پوچھا، "ہم نے، کیا ہم نے آج پھل کھائے تھے؟"

میروت نے کہا، "تو پھر کیا کھایا تھا ہم نے؟ بھول گئے؟"

"شاید تمھی بھول گئیں بہن۔ ہم نے تو پرندے اور بکری کا گوشت کھایا تھا۔"

میروت کو اتنی ہنسی آئی کہ چلتے چلتے رک گئی اور کہا، "تم ہمیشہ بھول جاتے ہو نجمی۔ پرندے اور بکری کا گوشت کیسے کھاؤ گے؟ ہم تو کسی جانور کو ذبح نہیں کرتے۔"

نجمی ذرا دیر کو خاموش رہا، پھر بولا، "کیا تم لوگ سچ مچ حیوان کو نہیں مارتے؟"

"یہ بات میں پہلے تم سے نہیں کہہ چکی ہوں؟ شاید تمھیں اس پر یقین نہیں آیا۔" میروت نے کہا۔

"میں تو یہ سمجھا تھا تم بھی ہمارے ہی جیسے ہو۔" نجمی بولا، "کتنے ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم حیوان کا ذبح کرنا پسند نہیں کرتے، اس کے باوجود انھیں مار کھاتے ہیں۔"

"تو پھر ضرور تم لوگ اپنے ملک میں مذاق کیا کرتے ہو۔"

نجمی نے کہا، "اچھا، اگر آج ہم نے گوشت نہیں کھایا تو کیا کھایا؟"

"ہم نے پھلوں کے سوا کچھ نہیں کھایا،" میروت نے کہا۔

نجم الدین حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس وقت تک وہ برابر یہی سوچتا رہا تھا کہ وہ روز کھانے میں گوشت اور سبزیاں کھایا کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ہر روز کے کھانے میں مزے کا صرف اتنا ہی فرق ہوتا کہ ہر روز جو کچھ آتا وہ پچھلے دن کے کھانے سے زیادہ خوش ذائقہ ہوتا۔ میروت تیزی سے آگے نکل چکی تھی۔ نجمی اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایک شفاف دیوار کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ دیوار نجمی نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت اس نے یہ بھی دیکھا کہ میروت اس دیوار میں ایک آلہ گھسا رہی

ہے اور دیوار میں ایک دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ اب تو وہ چلا اٹھا، "ارے یہ تو کوئی جادو جیسی چیز ہے۔"

میروت نے کہا، "وہ دروازہ ہے اور یہ اس کی کنجی ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟"

پھر وہ نجمی کے جواب دینے سے پہلے دروازے سے نکلی اور کہا، "اب میں تمھیں بعض ایسی چیزیں دکھاتی ہوں جن کا تمھیں یقین نہیں آ رہا ہے۔ جب تک تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتے، کسی بات کو سچ نہیں سمجھتے۔"

نجم الدین شفاف پتھر کی ایک لمبی سی چوکھٹ میں داخل ہوا۔ وہاں دن کی روشنی بہت تھوڑی تھوڑی آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میروت دیوار میں لگی ہوئی ایک کل کے پاس ٹھہر گئی اور اسے حرکت دی۔ فوراً پہلے دروازے سے ملتا جلتا ایک دروازہ کھل گیا۔ اس وقت نجمی کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ مارے حیرت کے اس کی زبان رک گئی اور اس نے میروت سے کوئی سوال نہ کیا۔

عجیب و غریب آلے

میروت نے جو پہلا حجرہ کھولا تھا، وہ پوشیدہ ٹوپی کا خزانہ تھا۔ یہ کمرہ سفید شفاف چٹان سے بنایا گیا تھا۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ اس کی دیواروں میں سے داخل ہو رہی تھی۔

نجمی نے پوشیدہ ٹوپی کا کھوج لگانے کے لیے ادھر ادھر غور سے دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ کمرے کی زمین اس کی آنکھوں کے سامنے ایسی ظاہر ہو رہی تھی جیسے وہ گہرے گول گڑھوں کا ایک سلسلہ ہو۔

میروت نے ایک گڑھے کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر سر کی طرف ہاتھ لے گئی۔ یہ حرکت کرتے ہی وہ نجم الدین کی نظر سے غائب ہو گئی۔ نجمی ڈر گیا کہ کہیں وہ گڑھے میں نہ گر گئی ہو۔ وہ گھبرا گھبرا کر چلانے لگا۔

میروت، میروت۔ کہاں ہو تم میروت؟

اب وہ دیوانوں کی طرح اپنے سامنے کے گڑھوں کی طرف جھک جھک کر دیکھنے لگا۔ جب اس نے میروت کے ہنسنے کی آواز سنی تو اسے اطمینان ہوا اور بولا، "جلدی میری نگاہوں کے سامنے آ جاؤ بہن، میرا دل سینے سے اڑا جاتا ہے۔"

اب تو میروت زور سے ہنسی، پھر ایک قدم چل کر ایک بارگی نجمی کے سامنے ظاہر ہو گئی۔

نجمی ہنسا اور بولا، "بلا شبہ تم نے جادو سیکھ لیا ہے بہن!"

میروت نے اپنا ہاتھ نجمی کی طرف بڑھایا اور کہا، "پکڑو اسے اور رکھ لو اپنے سر پر۔"
نجمی نے کہا، "میں کیا پکڑوں، مجھے تو کوئی چیز نظر نہیں آرہی ہے، بلکہ تمھارا ہاتھ تک نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میروت، کہاں گیا تمھارا ہاتھ؟"
"میں تم سے پہلے نہیں کہہ چکی کہ وہ خفیہ ٹوپی ہے۔"
اب نجم الدین نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی نرم جسم کو چھو رہا ہے۔ اس نے اس چیز کو اپنے سر پر رکھ لیا اور ہنستے ہوئے کہا، "کیا میں تمھیں نظر نہیں آرہا ہوں؟"
میروت بولی، "میں تو اپنے سامنے کچھ نہیں دیکھ رہی ہوں۔"
جس وقت نجمی نے وہ ٹوپی اپنے سر پر رکھی، ایسا معلوم ہوا جیسے کچھ لرزہ سا اس کے جسم پر سرایت کر رہا ہے۔ اس نے وہ اسے اپنے سر سے ہٹا دیا اور اس کی شکل دیکھنا چاہی تو کچھ نظر نہ آیا، بلکہ وہ ہاتھ بھی نہ دکھا جس سے وہ اسے پکڑے ہوئے تھا۔ وہ ڈر گیا اور اسے زمین پر پھینک دیا۔ اسی وقت کانوں کے سرسرانے کی سی آواز سنی اور دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے قدموں کے پاس زمین میں ایک گڑھا نکل آیا ہو۔
وہ تیزی سے کمرے سے نکلا جیسے اس ناگوار منظر سے بھاگنا چاہتا ہو۔ میروت نے قہقہہ مارا۔ اس کے پیچھے چلی اور جس طریقے سے دروازہ کھولا تھا، اسی طرح بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ لمبی چوکھٹ سے پاس کے دروازے کی طرف روانہ ہوئی۔ اسے بھی اسی طرح کھولا اور دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔
نجم الدین اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور اس کا دل کسی نئے تجربے کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھا۔
اس کمرے میں چھوٹے چھوٹے آلات رکھے تھے اور بڑے بڑے چٹانوں کے اندر تراشے ہوئے طاقچوں پر رکھے ہوئے تھے۔ میروت نے ایک آلہ اٹھایا اور اس میں لگے ہوئے چھوٹے سے بٹن کو حرکت دی۔ وہ آلہ بولنے لگا اور اس سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جو نجمی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ وہ چیخ مار کر اچھل پڑا۔ میروت نے جلدی سے اس کا بٹن گھمایا۔ آواز رک گئی اور وہ نجمی سے کہنے لگی، "تم اس طرح کیوں ڈر گئے بھائی؟ میں نے تم سے پہلے کہہ دیا تھا کہ اب تم سننے والا کان دیکھو گے۔"
اس وقت نجمی بولا، "یہ آلہ تو باتیں کرتا ہے۔ بہتر تھا کہ تم اس کا نام بولتی زبان رکھتیں۔"
میروت نے کہا، "تم نے صحیح کہا نجم الدین۔ مگر تم ہمیشہ ناموں کے معاملے میں بہت الجھتے رہتے ہو۔ اس آلے کا کام یہ ہے کہ یہ زمین کے دور دراز خطے سے آوازیں پکڑتا رہتا ہے، اس لیے اصل میں وہ ایک سننے والا کان ہے، مگر ساتھ ہی وہ ایک بولتی ہوئی زبان کا کام بھی دیتا ہے۔"

میروت نے دوبارہ ایک بٹن گھمایا۔ اب اس آلے سے مختلف آوازیں اور گانے نکلنے لگے۔ جب وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر بٹن گھماتی تو آوازیں اور گانے بدلے ہوئے آلے میں سے نکلنے لگتے۔ میروت اسی طرح بٹن گھماتی رہی، یہاں تک کہ ایک ایسے شخص کی آواز سنی گئی جیسے وہ پاس کے کمرے میں بیٹھا ہو۔
نجم الدین اس آواز کو پہچان گیا اور چلا کر بولا، "کیا یہ شیخ نجفی نہیں ہے؟"
میروت نے کہا، "میرا گمان غالب یہی ہے کہ یہ اسی کی آواز ہے، کیوں کہ یہ آوازیں بغداد سے آرہی ہیں۔"
نجمی کا دل وطن کی محبت سے بھر آیا اور اس نے میروت سے کہا، "اچھی بہن، جب تک میں اس کی پوری بات نہ سن لوں، یہ بٹن نہ گھمانا۔"
اس کے بعد وہ برابر سنتا رہا اور جب بولنے والا چپ ہوا تو وہ ایک لمبی سانس لے کر بولا، "ان میں سے ایک مصنوعی کان مجھے دے دو نا۔"
میروت بولی، "تاکہ تم ہر رات کو بغداد کی باتیں سنتے رہو، ہے نا نجمی؟"
نجم الدین نے نہایت ڈوبی ہوئی آواز سے کہا، "اگر میں بغداد کی باتیں سنا کروں۔"
اس وقت میروت نے پوچھا، شاید تم وہاں

بہت آرام سے بچے نجمی! تم بغداد سے بہت محبت کرتے ہو؟"

نجمی بولا، "نہیں، بلکہ میں وہاں سب سے زیادہ بدنصیب تھا بہن، مگر میں بغداد سے محبت کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں۔ وہ میرا وطن جو ہے۔"

میروت نے سر ہلایا اور کہا، "نجم الدین، میں جلد ہی ابا جان سے اس کی اجازت لے لوں گی۔ ان کی اجازت کے بغیر میں کوئی چیز نہیں دے سکتی۔"

پھر وہ یہاں سے نکلی، دروازہ بند کیا اور پاس کے کمرے کی طرف چلی۔ اس کمرے میں جو آلات تھے وہ پہلے دیکھے ہوئے آلات کی طرح نہ تھے۔ اس کا کوئی آلہ ایک چھوٹے دائرے سے بڑا نہ تھا جو آئینے سے ملتا جلتا تھا۔ میروت نے ان میں سے ایک آلہ اٹھا کر اپنی ایک آنکھ کی طرف بڑھایا اور آسمان کی بلندی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی، "یہ دیکھو ستارے میرے سامنے کھل کر نظر آ رہے ہیں۔"

سورج آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ نجمی زور سے بول اٹھا، "کیا یہ ممکن ہے؟"

میروت نے وہ آلہ اپنی آنکھ سے ہٹایا اور اس سے کہا، "لو اسے اپنی آنکھوں پر رکھو اور آسمان کی طرف دیکھو۔"

نجمی نے جیسے ہی آسمان کی طرف دیکھا، بول اٹھا، "یہ تو بڑی حیران کرنے والی آنکھ ہے۔"

میروت بولی، "تم اس سے زمین کی طرف دیکھو تو دور دور تک کی چھوٹی سے چھوٹی چیز تمہیں نظر آئے گی۔"

نجم الدین نے شوق بھرے لہجے میں پوچھا، "کیا میں اس سے بغداد کو بھی دیکھ سکتا ہوں بہن؟"

"ہاں اگر بغداد زمین کے اس سرے پر ہو۔" میروت نے کہا۔

نجم الدین نے کہا، "کیا سب زمین ایک ہی نہیں ہے؟ اسی میں بغداد بھی ہے۔"

میروت ہنسی اور بولی، "نجم الدین، تم نے سمندر کا سفر کیا ہے اور ایک زمین سے دوسری زمین پر گئے ہو۔ کیا تمہیں ہر دو زمین کا ایک نیا سرا نظر نہیں آیا؟"

اس پر نجمی بولا، "شاید تمہارا مطلب افق سے ہے۔" میروت نے کہا۔

"ہاں وہی۔ تم نے اس کا نام افق رکھا ہے۔ یہ آنکھ اگر افق کے پاس ظاہر ہو تو اسے بھی دیکھ لے گی۔"

پھر نجمی سے پوچھا، "کیا تمہیں ان آنکھوں میں سے کوئی آنکھ نہیں چاہیے نجمی؟"

نجم الدین افسوس کے لہجے میں بولا، "لیکن مجھے اس میں بغداد تو نظر ہی نہیں آیا۔"

اب میروت پاس کے کمروں کی طرف چل دی اور ان میں رکھے ہوئے آلات نجمی کو ایک ایک کر کے

دکھاتی رہی۔ وہ جس آلے کو بھی دیکھتا پہلے آلات سے زیادہ عجیب نظر آتا۔ اب تو اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ اس حیرت انگیز جزیرے میں ہر چیز ممکن ہے۔ انھی آلات میں اس نے ایک ایسا آلہ بھی دیکھا کہ اسے جسم پر رکھا جائے تو بدن کے تمام اعضا ظاہر ہونے لگتے۔ پھر ایک اور آلہ دیکھا جسے بدن پر رکھا جائے تو وہ اسے ایک بڑے ڈھانچے کی شکل میں دکھاتا تھا، جس پر گوشت کا نشان تک نہ ہوتا۔ ایک ایسا آلہ تھا کہ جسم پر رکھا جائے تو اس میں سردی کے اثر سے کپکپی پیدا کر دیتا یا شدید گرمی بدن کے اندر دوڑا دیتا۔ سب سے زیادہ انوکھی بات جو نجمی نے دیکھی، وہ ایک آلہ تھا جس میں گیہوں کا دانہ ڈال دیا جائے تو تیزی سے بڑھ جاتا، یہاں تک کہ اس میں بالیں نکل آتیں اور ایک ہی دن میں دانے پک جاتے۔

دوسرا آلہ ایسا دیکھا کہ اگر اس میں مرغی کے انڈے چند منٹ رہنے دیے جائیں تو ان میں سے چوزے نکل آتے۔ غرض نجمی نے جو کچھ یہاں دیکھا، اس سے اس کے دل میں یہ خیال جم گیا کہ دنیا میں کوئی چیز بھی مشکل نہیں ہے، فقط محنت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔

جب میروت اڑن غالیچے کے کمرے میں پہنچی تو اس نے نجم الدین سے کہا، "میں سمجھتی ہوں آج تم تھک گئے ہو گے نجمی۔ اور یہ غالیچہ کوئی ایسی دیکھنے کی چیز ہے بھی نہیں۔"

نجمی نے کہا، "وہ کون سا غالیچہ ہے بہن؟"

"وہی اڑنے والا غالیچہ، نجمی۔"

نجمی بول اٹھا، "بلاشبہ وہ ایک تعجب میں ڈالنے والی چیز ہے۔"

میروت نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا، "کیا تم غالیچے پر بیٹھ کر سیر نہیں کرنا چاہتے؟"

"بالکل نہیں۔ مجھ سے اس پر نہیں چڑھا جاتا۔" نجمی نے جواب دیا۔

میروت بولی، "کیا تم یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ زندگی ایک ہی ہے؟"

نجمی نے کہا، "اگر میری دو زندگیاں ہوتیں تو ان میں سے ایک کو خطرے میں ڈال دیتا۔"

میروت بولی، "تو پھر تمہیں اڑن غالیچہ دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم اس کے ذریعے فضا میں نہ اڑو تو اسے دیکھنے سے کیا فائدہ؟"

نجمی نے کہا، "وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ مجھے بڑا شوق ہے کہ اسے اڑتا ہوا دیکھوں۔"

"تو بھی وہ خود بخود تو اڑتا نہیں۔ اس کے لیے تو سوار ہونا ضروری ہے۔"

نجمی بولا، "تم بھی میرے ساتھ سوار ہو گی؟"

میروت نے ہنس کر کہا، "ہاں تاکہ وہ ہمیں گرا دے تو ہم دونوں ساتھ ہی مریں۔"

بجی نے شرماتے ہوئے جواب دیا، "میں سمجھتی ہوں، تم ساتھ ہو گی تو نہیں گرے گا۔"

اس وقت بیروت گودام میں داخل ہوئی۔ ایک غالیچہ اٹھایا اور بجی سے کہا، "اس کو زمین پر بچھاؤ اور سوار ہو۔"

نجم الدین آگا پیچھا سوچنے لگا اور بولا، "میں سمجھتا ہوں آج ہمیں بہت دیر ہو گئی ہے۔" بیروت کو اتنی ہنسی آئی کہ آنسو نکل آئے اور بولی، "سچ سچ آج ہمیں بہت دیر ہو گئی۔ اب ہمیں اس کی سواری دوسرے دن پر موقوف رکھنا چاہیے۔"

بیروت نے اوپر کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ بجی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا اور دونوں جس طرف سے آئے تھے، اسی طرف پلٹ کر جانے لگے۔

اس دوران میں بجی خاموشی کے ساتھ ان چیزوں پر غور کرتا جا رہا تھا جو اس تفریح کے دوران میں اس کی نظر سے گزری تھیں، اور جن کے حقیقت میں موجود ہونے کا اس نے کبھی تصور نہ کیا تھا۔ وہ قوم سفروت کے یہ کارنامے دیکھ کر ان لوگوں کو دنیا بھر کی سب سے زیادہ عجیب قوم سمجھنے لگا تھا اور یہ اس کا عقیدہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ معجزات تک پیش کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

سمندر میں رہنا بسنا

گرمی کا موسم آیا، آسمان پر سے بادل چھٹ گئے اور سورج کی روشن شعاعیں صبح سے شام تک اپنی آب و تاب دکھانے لگیں۔ قوم سفروت کے لوگ اپنے دستور کے مطابق سمندر کی گہرائی میں اترنے کی تیاری کر رہے تھے، اس لیے کہ سورج کی شعاعیں پانی کی گہرائی میں اس کے اندر سرایت نہیں کرتیں۔

نجم الدین اپنی بہن بیروت سے رخصت ہوا۔ بادشاہ، ملکہ اور دوسرے لوگوں کو بھی الوداع کہا۔ اس کی یہ رخصتی بہت اثر پیدا کر رہی تھی۔ وہ خود بھی آنسو نہ روک سکا۔

بیروت نے اس کا غم ہلکا کرنا چاہا اور اس سے ہنس کر کہا، "تم کیوں روتے ہو نجم الدین؟ گرمی کا موسم خوش گوار بنانے کے لیے ہمارے ساتھ چلیے۔"

بجی پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے بولا، "کاش کہ میری عزیز بہن کو معلوم ہو سکتا کہ اس وقت مجھے کتنا سخت صدمہ ہے۔"

اب بیروت نے سمندر کی گہرائی اور اس کے اندر کی کھوہوں کا حال بیان کرنا شروع کیا۔ پانی کی سطح صاف نیلے آسمان کی طرح نیچے سے جیسی ظاہر ہوتی ہے، اس کی تفصیل بیان کی۔ پانی کے جانوروں اور ان کی بے شمار قسموں کا ذکر کیا۔ موتی دینے والی سیپیوں اور مونگے کی گھاٹیوں کا حال کہا۔ نیلی اور سرخ مچھلیوں کو بتایا کہ وہ رنگین مرجانی گھاٹیوں کے درمیان کس طرح چھپ جاتی ہیں۔ پھر اس کا ذکر کیا کہ جب سورج کی نیلی شعاعیں سمندر کی گہرائی میں سرایت کرتی ہیں تو وہ ٹھہرنے کے وقت اپنے رفیقوں کے ساتھ بیٹھ کر جل پریوں کے گیت کس طرح سنا کرتی ہیں۔

بیروت بجی سے اسی طرح برابر باتیں کرتی رہی، یہاں تک کہ اس کا غم دور ہو گیا۔ پھر جب ان لوگوں کے پانی کے اندر اترنے کا وقت قریب آ پہنچا تو اس نے بجی سے کہا، "تم اپنا وقت سیر و تفریح کرنے اور مورتیاں بنانے میں گزار سکتے ہو۔ تمہیں گانے بجانے سے دل بہلانے کا موقع بھی حاصل ہے۔ تم اپنے اوقات ساحل پہاڑ اور جنگل کے درمیان گھوم پھر کر بھی بہت آسانی سے صرف کر سکتے ہو۔"

بجی نے کہا، "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے دور رہنے کے بعد میرا دل کس طرح خوش رہ سکتا ہے؟"

بیروت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "اور ہاں، میں نے جو آواز نکالنے کا آلہ تم کو دیا ہے، تم اس کے ذریعے مجھے جب چاہو، مخاطب کر سکتے ہو اور اس مصنوعی کان میں جو تمہارے پاس ہے، میری آواز سن سکتے ہو۔ اسی طرح جب چاہو کھوجی آنکھ سے کام لے کر مجھے دیکھ سکتے ہو۔ میں ساحل کے قریب ہر روز پانی کے نیچے بیٹھ جایا کروں گی تاکہ تم مجھے دیکھ سکو۔"

نجم الدین نے تھوڑی دیر سر جھکایا، پھر دونوں ہاتھ بیروت کی طرف بڑھائے اور بھائی کی طرح اس

کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد چاہا کہ کچھ ہنسی دل لگی کی باتیں کہہ کر بہن کو ہنسی خوشی رخصت کرے، مگر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس لیے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا، کیوں کہ وہ بائیں ہاتھ سے وہ اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

اور جب میروت پانی میں اتر گئی تو وہ تھوڑی دیر تک ساحل پر حیران پریشان کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس وقت اسے سخت وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ دن آنکھوں میں رات کی طرح تاریک معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے باقی دن ساحل کے قریب اسی حال میں گزارا کہ کبھی ٹہلنے لگتا اور کبھی بیٹھ جاتا۔ آنسو بار بار آنکھوں میں اُمڈ آتے تھے۔

جب سورج غروب ہو گیا تو بجی اپنی ٹانگیں گھسیٹتا ہوا جیسے تیسے محل میں پہنچا اور جو مسہری بھی قریب پائی اس پر دراز ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے سو جائے، مگر نیند کا دور دور پتا نہ تھا۔ آنسو البتہ برابر بہے جا رہے تھے۔

کالا پرندہ

بہن میروت کی جدائی میں نجم الدین کے دن اور راتیں بڑی بے چینی سے گزر رہی تھیں۔ وہ اکیلا رہ گیا تھا اور پہاڑ اور جنگل کی سیر سے دل بہلاتا رہتا۔ کبھی پہاڑ کی کھوہوں میں، کبھی سمندر کے ساحل پر پہنچتا اور جب رات آتی تو پھر محل میں لوٹ آتا۔ یہاں اسے پھر طرح طرح کی فکریں گھیر لیتیں اور اسے سونے نہ دیتیں۔ وہ دل بہلانے کو دور سے باتیں کرنے کا آلہ، کبھی آنکھ اور مصنوعی کان وغیرہ سے کام لیتا، پھر بھی

اس کی گھبراہٹ دور نہ ہوتی اور وہ یہی محسوس کرتا رہتا جیسے کسی ویران سنسان قید خانے میں اکیلا رہ گیا ہو۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ ادھر تو اسے میروت کا شوق اور یہاں کی تنہائی پریشان کرتی، اُدھر وطن کا اشتیاق بھی اس کے دل میں بڑھتا جاتا۔ وہ زیادہ وقت مصنوعی کان کے پاس بیٹھ کر گزارتا اور رات کا کچھ حصہ بغداد کے راستوں اور وہاں کی مسجدوں میں جو باتیں ہوا کرتیں ان کے سننے میں صرف کرتا۔ اس کام میں اس کا دل بہت بہلتا۔ اس طرح وطن کا شوق بجی کے دل میں روز بروز بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک مہینا گزر گیا اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے بہت لمبی مدت گزر گئی ہے۔

اسی طرح یہ بھی بڑی عجیب بات تھی کہ بجی نے بغداد میں جتنی مصیبتیں اٹھائی تھیں اور وہاں مفلسی اور ناکامی کے جو مزے چکھے تھے، سب بھول گیا۔ اب اسے اپنی پچھلی زندگی کی باتوں میں صرف دجلے کے خوب صورت ساحلوں کے حسین منظر یاد آتے تھے۔ وہ ہرے بھرے کھیتوں اور پھلے پھولے باغوں پر سورج کا طلوع ہونا اور کھجوروں کے درختوں پر اس کے غروب ہونے کا سماں یاد کیا کرتا اور انھیں کے تصور میں کھویا رہتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دل و دماغ میں رہ رہ کر چکر لگاتے رہتے۔ سوچتے سوچتے اس کی طبیعت اکتا جاتی۔ کبھی اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی کہ کاش کوئی دریائی کشتی اسے اس تنہائی سے نجات دلاتی اور اس دور دراز مقام سے اس کے پیارے وطن تک پہنچا دیتی۔

وہ جب سمندر کے کنارے ٹہلنے جاتا تو افق میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتا کہ شاید کسی کشتی کا بادبان ساحل کے قریب نظر آئے اور وہ اسے ساحل کے پاس آنے کا اشارہ کرے یا سمندر میں کود کر تیرتا ہوا یا موجوں کے سہارے بہتا ہوا اس کشتی میں پہنچ جائے۔ لیکن یہ سب خیالات بے بنیاد ثابت ہوتے اور ہر مرتبہ ناکام و نامراد محل کی طرف لوٹ جاتا۔ اب وہ انھی چٹانوں کے درمیان جو پہلے اسے بہت خوب صورت نظر آتی تھیں ہو کر گزرتا تو وہ اسے یوں معلوم ہوتیں جیسے قیدی کو جیل کی دیواریں۔

جس وقت طبیعت بہت بے زار ہوتی تو اس کا جی چاہتا کہ گوداموں کی سیر کرے اور ان میں محفوظ کی ہوئی چیزیں دیکھ کر دل بہلائے۔ لیکن میروت کی بتائی ہوئی احتیاطی تدبیریں اور خطروں کی دھمکیاں یاد آتیں تو رک جاتا۔ اس کے بعد ہر مرتبہ چلتے وقت اپنے دل سے پوچھتا: اس سے نقصان ہی کیا ہوگا۔

آخر اسی کھینچا تانی میں وہ اس چھوٹے سے تنگ راستے پر ہو لیا جو محل کے پچھلے دروازے کی طرف پہنچاتا تھا اور چلتے چلتے زمین دوز کمرے میں جا پہنچا۔ یہاں اس نے سب دروازے ایک ایک کر کے کھولنا شروع کیے۔ جو چیزیں اور رنگینیاں ان میں رکھی ہوئی تھیں، انھی کے دیکھنے میں پورا دن گزر گیا۔ اب کبھی اسے دل کا بوجھل پن کم ہوتا محسوس ہوا اور اس رات کو وہ خوش خوش محل واپس

ہوا۔ نیند بھی خوب آئی اور ترے سے صبح تک سوتا رہا۔

اس دن سے وہ گوداموں کی بہت سیر کرنے لگا۔ ہر روز اسے ایک نہ ایک عجیب چیز نظر آتی جس سے عقل دنگ رہ جاتی۔ ایک دن اس کے جی میں آئی کہ خود شاہ سلیمان کا مقام دریافت کرے۔ اس دھن میں وہ عجوبے راستے پر چلتے چلتے اس دیوار تک جا پہنچا جو گوداموں اور مقدس شخصے کے مقام کے بیچوں بیچ بنی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اتنی محنت کے بعد بھی اس دروازے کا کھوج نہ لگا سکا جس میں خزانہ تھا۔ اس کوشش میں عاجز رہنے کی وجہ سے اس کی بے قراری اور بڑھ گئی اور خزانے کے مقام تک پہنچنے کی خواہش بری طرح دل میں مچلنے لگی۔ اس الجھن میں وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور تھکن محسوس کرنے لگا۔ دل کی کدورت اور طبیعت کی وحشت دور کرنے کی کوشش میں ایک مہینا اور بیت گیا۔ وہ ناکامی سے اتنا عاجز ہو گیا تھا کہ جزیرے سے نفرت کرنے لگا اور اس کے دل میں خیال آیا کہ اڑن غالیچے کے گودام میں جائے اور ایک غالیچہ لے کر جزیرے سے اڑ جائے۔ اس نے اس خیال کو پورا کرنے میں کوئی تامل نہ کیا اور ایک قالین لے کر باغ میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے قالین کو ہر طرف سے ٹٹولنا اور دیکھنا بھالنا شروع کیا کہ شاید کوئی کنجی ہاتھ لگ جائے یا کسی بٹن پر ہاتھ پڑے جس کو دبا کر وہ اڑن غالیچے کو حرکت دے سکے۔ مگر اس میں کوئی ایسی چیز نہ ملی۔ ظاہر میں یہ قالین معمولی قسم کے قالینوں سے کچھ مختلف نہ تھا جو شیراز، تبریز یا خراسان میں بکثرت بنائے جاتے ہیں۔ آزردہ جھنجلا کر اسے الٹنے پلٹنے اور جھٹکنے لگا۔ پھر اس نے زمین پر اسے جھٹک مارا۔ اب تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے قالین سے یہ آواز نکلتی سنی، "حاضر ہوں میرے آقا، کیا حکم ہے؟"

نجمی اپنی جگہ اچھل پڑا اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ پھر اپنے جی میں کہا، "ضرور یہ آواز اسی قالین میں سے آ رہی ہے۔"

اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا، "میں ہوا میں اڑنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا اور فقرہ پورا نہ کرنے پایا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ غالیچے پر سواری کی آزمائش تو کی نہیں، ایسا نہ ہو وہ مجھے لے کر زمین پر آ رہے...... پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر بولا، "میں چاہتا ہوں کہ مجھے لے کر تھوڑی دیر ہوا میں اڑو اور آہستہ آہستہ اڑ کر واپس لے آؤ۔"

اب اس نے ایک آواز پھر سنی، "جو حکم ہو میرے آقا، تعمیل ہو گی۔"

اب نجم الدین نے قالین زمین پر بچھایا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس پر بیٹھتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے وہ حرکت میں ہے اور وہ آہستہ آہستہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ ابھی ایک پل بھی نہ گزری تھی کہ قالین پہاڑ کی چوٹی پر سے ہوتا ہوا دھیرے دھیرے پرواز کر رہا تھا اور اس کی اڑان سے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔

نجمی نے اس مختصر سے تجربے کو کافی سمجھا اور چلّا کر کہا، "بس بس اے قالین، جیسے اطمینان سے ہوا پر بلند ہوئے اسی طرح جزیرے میں لوٹ چلو۔"

نجمی کو اس بات کا کوئی جواب نہ ملا اور قالین اسی طرح اڑتا رہا۔ اس نے غصے میں اپنی بات پھر دہرائی اور کہا، "میں نے تم سے کہہ تو دیا۔ بس کرو اور جلدی سے زمین پر پہنچا دو۔"

اب بھی نجمی کا کہنا بے کار گیا۔ اس نے خوف کی حالت میں گھبرا گھبرا کر بار بار یہی بات کہی۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اس وقت نجمی کو یاد آیا کہ اسے وہ بھید یاد نہیں رہا جس کے ذریعے قالین "حاضر ہوں" کہنے لگتا ہے۔ وہ دل میں پچھتا رہا تھا کہ وہ بھید معلوم کیے بغیر اس نے ہوا میں بلند ہونے کی غلطی کیوں کی۔ اب اس کی حیرانی بڑھ رہی تھی اور وہ پسینے پسینے ہوا جاتا تھا۔ مایوس ہو کر وہ قالین پر جھکا اور گرنے کے ڈر سے اس کے حاشیے پکڑ لیے پھر دونوں آنکھیں بند کر لیں تاکہ نیچے کی فضا نظر نہ آئے۔ اس دوران میں اس نے قالین کے

چھینٹنے خوب زور سے پکڑ لیے۔ اب پھر ایک آواز کو یہ کہتے سنا، "حاضر ہوں میرے آقا جو حکم ہو۔"

نجم الدین فوراً چیخ کر بولا، "مجھے جلد زمین پر لے چل اے احمق قالین!"

قالین تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ نجمی کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا دل اس کے قدموں میں لوٹ رہا ہے۔ دو ہی چار منٹ کے اندر وہ باغ میں واپس آ گیا۔ اس کا سر زمین سے اتنے زور سے ٹکرایا کہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

اس وقت نجمی کا بدن لرز رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ سنبھالنے سے انکار کر رہی ہیں۔ وہ اپنی پیشانی سے پسینا پونچھ رہا تھا اور ٹانگیں گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ سر کے ساتھ اس کا بدن بھی چکرا تا محسوس ہوتا تھا۔

اب وہ ایک تھوڑی سی کھلی جگہ پر بیٹھ گیا جس کے چاروں طرف گھنے درخت تھے اور ہوا کے جھونکوں سے مہکتی ہوئی پھلوں کی خوشبو چلی آ رہی تھی۔ یہاں نجمی کو خاصا آرام ملا اور وہ اپنی کھوئی ہوئی قوت بحال کر سکا۔

بھوک لگی ہوئی تھی۔ نجمی نے اٹھ کر درختوں کے پھل توڑ توڑ کر کھانا شروع کیا۔ ابھی وہ فارغ نہ ہوا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک کالی گھٹا باغ پر سایہ کیے ہوئے ہو۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک سیاہ رنگ کا بہت بڑا پرندہ سامنے ہوا میں معلق ہے۔ اس کا جسم شتر مرغ کی طرح ہے۔ دُم آدمی کے قد کے برابر ہے اور دونوں پر کشتیوں کے بادبانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کی چونچ خم دار تلوار کی ایسی ہے اور اس کے پنجے شیر کے پنجوں کی طرح ہیں۔ یہ دیکھ کر نجمی کے دل میں خوف بیٹھ گیا۔ اس نے چاہا کہ قریب کوئی جگہ نظر آئے تو بھاگ کر اس میں پناہ لے، مگر کہاں آسمان میں سر پر منڈلانے والا اتنا بڑا پرندہ اور کہاں ایک کمزور انسان۔ بھاگنے کی کوشش بے فائدہ نظر آئی اس لیے نجمی نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا اور سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا کہ شاید یہ پرندہ اس کے پاس سے چلا جائے۔

لیکن پرندہ زمین پر نجم الدین کے قریب اتر گیا اور اس کی طرف منہ کر کے چلنے لگا۔ اس وقت وہ اپنی چونچ غصے کے ساتھ زمین پر رگڑتا جاتا تھا۔

نجم الدین کے پاس کوئی ہتھیار تو تھا نہیں جو لڑنے کا ارادہ کرتا۔ اس لیے اس نے چاہا کہ ایک پھل اس کی طرف پھینک کر اسے بہلائے، مگر پرندے نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور وہ اپنی چمکتی ہوئی تیز نگاہوں سے نجمی کو دیکھنے لگا۔ نجمی دل میں سمجھا کہ شاید وہ اسے پھاڑ کھانے پر تلا ہوا ہے، اس لیے مستعد ہو کر کھڑا

ہو گیا کہ جہاں تک ہو سکے اپنا بچاؤ کرے۔ پرندے نے اپنی ڈراؤنی چونچ کھولی اور ڈرانے کے لیے نکیلے چنگل بلند کیے۔ نجمی پرندے کی یہ وضع دیکھ کر دل میں سہم گیا، مگر ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ پرندے نے ڈرانے کے سوا ابھی تک کوئی حملہ نہیں کیا۔ اس لیے وہ تھوڑی دیر دیکھتا اور انتظار کرتا رہا کہ دیکھیں پرندہ اب کیا کرتا ہے۔

نجمی کے یہ دیکھتے ہی دیکھتے پرندے کے تیور نرم پڑ گئے اور وہ ذرا پیچھے کی طرف سرک گیا۔ اس وقت نجمی نے اسے بات کرتے ہوئے سنا۔ سچ مچ وہ کہہ رہا تھا، "تم میری مخالفت کیوں کرتے ہو؟ میں تمھاری مدد کرنے آیا ہوں۔"

نجمی کا دل بڑھا اور اس نے کہا، "تمہارا شکریہ۔ مگر تم میری مدد کس طرح کرو گے؟"

پرندہ بولا، "کیا تم سلیمان کا خزانہ نہیں دیکھنا چاہتے؟"

نجمی نے جلدی سے کہا "بے شک چاہتا ہوں۔"

پرندہ زوردار آواز میں بولا، "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں تمہیں خزانے کا راستہ دکھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر پرندہ گودام اول کے گلیارے پر ہو گیا۔ نجم الدین خوش خوش اس کے پیچھے چلتا رہا۔ کیوں کہ یہ پرندہ بغیر کسی انتظار کے اسے خزانے کی رہبری کرنے آیا تھا۔

جب پرندہ اس دیوار تک پہنچا جو اس تنگ راستے اور مقدس شعلے کے مقام کے بیچ میں تھی تو وہ ٹھہر گیا اور اپنا سر جلد جلد نیچے کرنے اور ایک چمکتی ہوئی چٹان پر اپنی چونچ رگڑنے لگا۔ نجمی دیوار کی طرف بڑھا تو اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے چٹان کا ایک ٹکڑا دیکھا۔

پرندے نے کہا، "اپنا ہاتھ یہاں رکھو۔" مگر نجمی کو کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس وقت پرندہ غصے بھرے لہجے میں بولا، "وقت ضائع نہ کرو۔ رات قریب آ رہی ہے۔ ٹھیک اس جگہ انگلی رکھو جس جگہ میں چونچ سے اشارہ کر رہا ہوں۔"

نجم الدین پرندے کی بتائی ہوئی جگہ اپنا ہاتھ اور انگلیاں پھیرنے لگا۔ پرندہ کبھی اس جگہ چونچ مارتا اور کبھی اپنے ناخنوں سے ٹھونگیں مارتا۔ یہاں تک کہ اس کے ناخن کے نیچے ایک نرم جگہ نظر آئی پھر اسی جگہ ایک دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا نظر آیا۔ پرندہ اس کے اندر چلا گیا اور پلک جھپکانے میں لوٹا تو اپنے دہانے کے اندر کوئی چیز دبائے ہوئے تھا۔ وہ تھوڑی دور گلیارے میں چلا پھر ہوا میں اڑنے لگا اور ایک لمحے کے اندر ایک کالے بادل کی طرح آسمان کی بلندی پر پرواز کرنے لگا۔

اسی موقع پر نجم الدین کو خیال آیا کہ یہ تو کالا پرندہ ہے جس سے بادشاہ نے اور میروت نے ڈرایا تھا وہ خوف کھا کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا اور سوچنے لگا کہ افسوس میں نے یہ کیا کیا، میں نے پرندے کی بات مان لی۔ اس کے لیے خزانہ سلیمان کا دروازہ کھول دیا اور وہ کوئی چیز اس میں سے نکال کر منہ میں دبائے ہوئے اس طرح تیزی سے اڑ رہا ہے جیسے وہ جس غرض سے آیا تھا، وہ پوری ہو چکی ہو۔

پھر نجمی سوچنے لگا، مگر یہ چیز تھی کیا جسے وہ لے اڑا۔ اب وہ کھویا کھویا سا خزانے میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے کالا ذوم و شمع کی بہت سی بوتلیں دیکھیں جن پر زنگ چڑھ گیا تھا۔ یہ نقشہ دیکھ کر نجمی چلا اٹھا، "کیا یہی ہے سلیمان کا خزانہ؟"

اب نجمی کے دل پر ایک طرح کی مایوسی اور خوف کا غلبہ تھا اور وہ یہ سوچ کر سہما ہوا تھا کہ وہ منحوس

کل منحوس پرندہ اس بوتل کا کیا حشر کرتا ہے، جسے وہ اپنے منہ میں دبا کر اڑ گیا۔

اس رات کو جب نجم الدین محل واپس ہوا تو اس کا دل غم کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے سونا چاہا تو فکر کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ یہ سوال دوبارہ اس کے دل میں ابھرتا تھا کہ دیکھنا یہ ہے کہ وہ منحوس پرندہ اس بوتل کا کیا حال کرتا ہے؟

جزیرے کی تباہی

اب نجم الدین کے دل میں صبح و شام طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے رہتے اور دل کی ہر دھڑکن میں اسے ایک چبھن سی محسوس ہوا کرتی۔ اس لیے کہ اس نے شاہ سومو اور اپنی بہن میروت سے جو وعدہ کیا تھا پورا نہیں کیا۔ وہ بعض وقت یہ سوچنے لگتا کہ ممکن ہے کالا پرندہ خزانہ سلیمان سے چرائی ہوئی بوتل کے ذریعے قوم سفروت پر کچھ بلائیں نازل کر دے۔

نجمی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب اس کی بہن میروت سمندر سے واپس آئے گی تو وہ اسے کس طرح منہ دکھائے گا۔ بادشاہ سومو کا سامنا کس طرح کرے گا جس نے اس کو اپنے محل میں رکھا اور ہر جگہ اس کی عزت کا خیال رکھا۔

صبح کو وہ محل کی گزرگاہوں پر ٹانگیں گھسیٹتا ہوا جاتا تھا۔ ان اطراف کا ہر ستون اسے میروت جیسی بہن اور اس کے شفیق ماں باپ کی محبت یاد دلاتے اور ان دنوں کا نقشہ نگاہوں میں پھر جاتا جو یہاں مہمان رہ کر اس نے گزارے تھے۔ اب اس کے دل میں یہ خواہش زور پکڑ رہی تھی کہ میزبانوں کے سمندر سے نکل کر اوپر آنے کا زمانہ آنے سے کچھ پہلے جزیرہ چھوڑ کر چلا جائے، تاکہ جن لوگوں نے اسے ایسی عزت اور محبت سے رکھا تھا ان کے چہروں پر بھی اس کی نظر نہ پڑے۔

اب وہ جزیرے کے اطراف میں اس انداز سے گھومنے پھرنے لگا جیسے وہ عن قریب اس سے رخصت ہونے والا ہے۔ اس درمیان میں وہ گزرتا تو ان شہر یا جھیلوں کے پاس سے گزرا جن سے وہ اکثر اپنا پیار سمجھا کرتا تھا۔ پھر گلابی رنگ کی گھوموں میں اور اس کے بعد نیلے رنگ کے صاف پانی کی جھیل پر گیا۔ اسی سلسلے میں ساحل پر جا پہنچا اور تھوڑی دیر پانی میں رقص کرتی ہوئی موجوں سے کھیلتا اور تیرنے سے لطف اٹھاتا رہا۔ اس موقع پر اسے میروت کو خیرباد کہنے کا خیال بھی آیا۔ اس نے کچھ دیر میروت کی آواز بھی اور اسے پانی کے نیچے ساحل کے قریب کھڑے دیکھا جو یہ امید لگائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی کہ نجمی جلد ہی "گھورچی آنکھ" کے ذریعے اسے دیکھے گا۔ اس نے یہ دعا پوری اس سرزمین کی خوبیاں یاد کر کے

گویا وہ جیسے وہ چھوڑنے کا عزم کر چکا تھا۔

جب سورج غروب ہونے کا وقت قریب آیا تو نجمی اس بڑے غار کی طرف گیا جس میں ہر قسم کے عجائبات کے گودام تھے۔ اس نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ غار پیچھے والے گودام سے اڑن غالیچہ نکال کر بغداد کا سفر اختیار کرے خواہ راستے میں کیسے ہی خطرے پیش آئیں کسی کی پرواہ نہ کرے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک میروت اور اس کے گھر والوں اور اس کی قوم کو منہ دکھانے کے مقابلے میں بڑے سے بڑا خطرہ بھی آسان تھا۔

یہاں پہنچ کر جب اس نے غالیچہ نکالا اور باغ کی زمین پر بچھا کر اس پر سوار ہونا چاہا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے کان میں کہہ رہا ہے، "تو جس حالت میں بغداد سے آیا تھا، اب پھر ویسا ہی فقیر ہو کر جا رہا ہے۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ اپنے ساتھ تھوڑے سے جواہرات کیوں نہیں لے جاتا جو جزیرے کی سطح پر جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ یہاں کے گوداموں میں پڑا ہوا تھوڑا سا سونا کیوں نہیں رکھ لیتا۔ یہی نہیں، یہاں کے بعض عجیب و غریب آلات کیوں اپنے ساتھ نہیں لے جاتا جو بغداد یا کسی اور شہر کے لوگوں نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ نہ ایسی چیزیں کبھی ان کے خواب و خیال میں آئی ہوں گی۔"

ان وسوسوں کے بعد بھی وہ دیر تک سوچتا رہا اور جو آواز کان میں گونج رہی تھی، اس پر عمل نہ کر سکا۔ اس کے لیے یہ بات آسان نہ تھی کہ وہ کوئی ایسا کام کر بیٹھے جو چوری سے کم نہیں، بلکہ یقیناً چوری ہے۔ اس نے خیال میں اپنی بہن میروت کی شکل دیکھی تو شرم سے پانی پانی ہو گیا اور دل میں سخت الجھن ہونے لگی۔ اس نے غالیچے پر بیٹھنا چاہا تاکہ اس زمین سے اور اس کے سونے، جواہرات اور آلات وغیرہ سے دور نکل جائے اور شیطان کا وسوسہ دل پر غالب نہ ہونے پائے، ورنہ اسے میروت کی حقارت آمیز نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن ان خیالات کے مقابلے میں گمراہ کرنے والا وسوسہ زیادہ زور پر تھا۔ اسے پھر ایسا معلوم ہوا جیسے وہی شخص پھر اس کے کان میں کہہ رہا ہے:

"اگر تم تھوڑے سے یہ جواہرات لے جاؤ گے تو اس سے میروت کو کیا نقصان پہنچے گا۔ یہ تو زمین پر پڑے ہوئے سنگ ریزے ہیں اور یہ سونا بھی یہاں کوڑا مال ہے۔ بالکل مٹی ہے جس پر گھاس پھوس اگ آتی ہے۔ اسی طرح بعض آلات جو میروت نے سمندر میں اترنے سے پہلے تمہیں بخش دیے ہیں، اپنے ساتھ لے جاؤ گے تب بھی میروت کو کچھ محسوس نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ اس نے اپنی خوشی سے تمہیں دیے ہیں۔"

نجم الدین ان خیالات میں بڑا الجھتا رہا۔ شیطانی وسوسوں اور ضمیر کی آواز دونوں کے درمیان دیر تک کھینچا تانی جاری رہی۔ آخر دل میں کمزوری پیدا ہو گئی اور اس نے ٹھان لی کہ جب لوٹ کر بغداد جائے گا تو

مال دار اور طاقت ور بن جائے گا۔ پھر بھی اس نے اپنے جرم کے احساس کو ہلکا کرنا چاہا اور ایک کاغذ اور قلم اپنے ہاتھ میں زخم لگایا اور اپنے خون سے میروت کو خط لکھنے لگا، تاکہ یہ خط بہن کے تکیے کے نیچے رکھ دے۔ اس نے سوچا کہ جب محل میں آ کر سونے لگے گی تو یہ خط اسے مل جائے گا۔ شاید وہ اسے پڑھ کر میری خطا معاف کر دے۔

خط اس مضمون سے شروع کیا تھا:

"پیاری بہن، میں یہ خط تمہیں اپنے خون سے لکھ رہا ہوں، تاکہ تمہیں میرے غم کا اندازہ ہو سکے۔"

پھر اپنا مختصر حال، کالے پرندہ کا واقعہ اور سفر کا ارادہ بیان کر کے جواہرات، سونے اور آلات وغیرہ کا ذکر کیا جنھیں ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ یہ چیزیں اسے بخش دے اور اس کا یہ قصور معاف کر دے کہ اس نے بہن سے اجازت لینے سے پہلے یہ چیزیں لے لیں۔

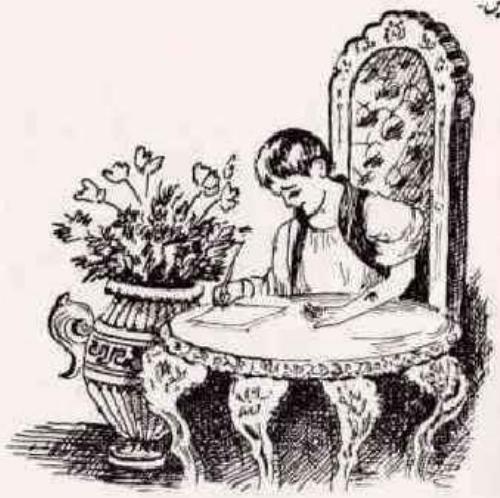

آخر میں اس نے لکھا:

"مجھے تمھاری شریفانہ طبیعت پر بھروسا ہے اور اس کا یقین ہے کہ تم اپنے اس بھائی کو معاف کر دو گی جس کو تم سے اتنی محبت ہے جتنی زندگی میں اب تک کسی سے نہیں ہوئی۔

"نجم الدین"

پھر اس نے وہ خط اپنی جیب میں رکھ لیا، تاکہ سفر کی تیاری سے فرصت پا لے۔

اس کے بعد نجمی سمندر کے کنارے گیا پہلے سب سے اچھے اور بڑے بڑے آب دار جواہرات لیے، پھر سونے کے ایک بڑے تھیلے میں بھرے اور وہ تمام آلات رکھے جو اسے میرودت نے عطا کیے تھے۔ پھر یہ سب چیزیں اڑن غالیچے پر رکھ دیں۔

جب اس نے غالیچے پر سوار ہونے کا ارادہ کیا تو اسے یاد آیا کہ اس نے خزانۂ سلیمان سے کوئی بوتل نہیں لی۔ اس لیے وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا کہ بوتل نکالے یا نہ نکالے، اس لیے کہ اسے بوتل کا کوئی فائدہ معلوم نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ یہ کام آنے والی اچھی چیز ہے یا کوئی مہلک آفت ہے۔

اس وقت پھر کوئی آواز اس کے کان میں یہ کہتی ہوئی معلوم ہوئی: "بغداد میں بڑے بڑے عالم، نجومی اور جادو اور جنوں کے پوشیدہ علوم جاننے والے حکیم موجود ہیں۔ یہ لوگ بے شک و شبہ بوتل کا بھید بتانے میں تمھاری مدد کریں گے۔ تمھیں یہ چاہیے کہ بغداد واپس جاتے وقت سلیمان اعظم کے خزانے کا ایک حصہ ساتھ لیتے جاؤ جنھوں نے اسی خزانے کی پراسرار چیزوں کے ذریعے جن و انسان کو قبضے میں کر رکھا تھا۔

اب نجمی کا دل مضبوط ہو گیا اور وہ اس خزانے میں سے ایک تانبے کی بوتل اٹھانے کے لیے چلا۔ جیسے ہی وہ چند قدم آگے بڑھا، اس نے ایک بہت بڑے دھماکے کی آواز سنی۔ زمین اس کے پیروں کے نیچے اس طرح لرزتی معلوم ہوئی جیسے بڑا خوف ناک زلزلہ آ گیا ہو اور پیچھے کی چٹانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیے دے رہا ہو۔

وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا کہ غار گر کر اس کے سر پر نہ آ رہے۔ وہ پہاڑ کے دامن کی طرف جا رہا تھا اور زلزلے اور دھماکوں کی آوازیں کان پھاڑے دے رہی تھیں۔ اس نے آسمان پر بجلیاں ہر طرف کوندتی ہوئی دیکھیں۔ اس کے ساتھ ہی نہایت تیز جھلستی ہوئی آندھیاں چل رہی تھیں۔

یہ حالت دیکھ کر نجمی تھر تھر کانپنے لگا۔ بدحواسی کی وجہ سے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ وہ یہاں سے اتر کر ساحل کے رخ پر چلنے لگا کہ شاید وہاں کوئی بچاؤ کی صورت نظر آ جائے۔

اب وہ جو قدم بھی بڑھاتا، اس کے دل میں ایک چوٹ کی سی کسک محسوس ہوتی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جزیرے کے ٹکڑے اڑتے جا رہے ہیں اور یہاں کی ساری خوش نمائی پل بھر میں برباد ہوئی جاتی ہے۔

اسے تمام درخت دھڑا دھڑ جلتے نظر آ رہے تھے ان کے تنوں کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے کسی صدیوں پہلے کے ویران مندر کے ستون ہوں جو ٹوٹ پھوٹ چکے ہوں۔ اس کے چشمے شیریں پانی سے محروم ہو چکے تھے۔ اب ان میں بدبودار متعفن کیچڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ جھیل سوکھی پڑی تھی۔ پانی کی جگہ اس میں کالی دلدل بھری ہوئی تھی۔

اب اس کے چاروں طرف جواہرات بکھرے نظر آتے تھے۔ تمام سنگ ریزے

جل جل کر ریزہ ریزہ ہوتے جا رہے تھے۔

نجمی اس قدر تیزی سے بھاگنے لگا کہ یہ تباہی اور بربادی کے نظارے اس کی آنکھوں کو اور نہ دیکھنا پڑیں۔ اس دوڑ دھوپ میں وہ گر پڑا اور اس کے دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں میں چوٹ لگ گئی۔ مگر وہ ہمت کر کے اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے وہ شیطان سے بچنے کے لیے بھاگ رہا ہو۔ جس وقت وہ سمندر کے کنارے پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کو بے حد مایوسی ہوئی کہ پانی کی سطح سے بھی نیلے نیلے شعلے اٹھ رہے تھے اور آندھی کی خوف ناک لہروں کی طرح بڑھتے جا رہے تھے۔ ایسے میں نجمی کو اپنی بہن میروت یاد آئی جو اس زمانے میں سمندر کی سطح کے نیچے رہا کرتی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ پھر اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی، ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

جق رہا ہو گیا

نجم الدین کو ہوش آیا تو اس کی عقل ٹھکانے نہ تھی۔ وہ کچھ نہ جانتا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا اور نہ یہ سمجھتا تھا کہ آس پاس یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اب رات ہو چکی تھی اور چودھویں کے چاند کی روشنی اسی طرح پھیلی ہوئی تھی جس طرح اس نے جزیرے میں آ کر پہلی رات کو دیکھی تھی۔

اس کے بعد نجمی آہستہ آہستہ چیزوں کو پہچاننے لگا۔ جو لوگ اس کے قریب کھڑے تھے انھیں دیکھ غور سے ان کے چہروں کو دیکھا تو ان کے درمیان اسے اپنی بہن میروت بھی نظر آئی۔ پلک جھپکتے میں بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور آنکھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بول اٹھا، "میری طرف نہ دیکھنا میں نے قصور کیا ہے میروت۔" پھر اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میروت نے اپنا ہاتھ نجمی کے سر پر رکھا جو بخار سے پھنک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسفنج کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ نجمی کے سر پر مل دیا۔ یہ ایک خوش بودار عرق میں تر تھا۔ اس سے نجمی کی تکلیف میں کمی ہوئی۔ میروت نے نرم لہجے میں کہا، "صبر کرو میرے بھائی صبر کرو۔ خدا کا حکم کوئی نہیں ٹال سکتا۔"

نجمی سسکیوں کے درمیان بولا، "میں نے وعدہ خلافی کی ہے بہن۔"

میروت نے اپنے احساس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "ہاں، میں جانتی ہوں تم نے کالے پرندے کا کہا مان لیا۔"

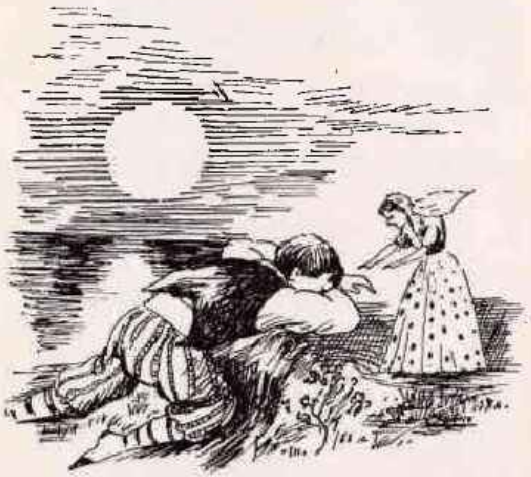

نجم الدین نے گھٹی گھٹی کم زور آواز میں کہا، "ہاں، مجھ سے یہ قصور ہو گیا۔ میں نے منحوس کلوٹے پرندے کی بات مان لی۔"

تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ پھر میروت ٹھہر ٹھہر کر بولی، "خدا کی مرضی اسی طرح تھی۔"

ارسا حکیم اپنی زرد لمبی داڑھی کو انگلیوں سے چھیڑتے جاتے تھے۔ ان کے چہرے سے غم کے آثار ظاہر تھے۔ آس پاس مقدس شعلے کے پجاریوں کی ایک جماعت کھڑی تھی۔ میروت ان کی طرف منہ کر کے بولی، "تم لوگوں نے جو مدد کی ہے، میں اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اب تم سب اپنے اپنے کاموں پر جا سکتے ہو۔ اس کی حالت خطرے سے باہر ہو چکی ہے۔"

اس وقت نجمی نے جانا کہ یہ سب بے چارے میروت کی مدد کرنے آئے تھے۔ اب اسے اپنے غم کے ساتھ دل میں ایک نئی چبھن سی محسوس ہوئی۔ مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ چپ ہو رہا۔ جب ارسا اور ان کے ساتھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو نجمی نے اپنے آپ کو میروت کے قدموں پر ڈال دیا اور بڑی دل سوزی کے ساتھ پوچھا

خدا کے لیے جن بتاؤ یہ کیا ہوا۔ جزیرے پر آفت آ گئی کہ وہ ایک لمحے میں اجڑ کر رہ گیا۔ یہ آگ کس چیز سے لگی۔ کس چیز نے زمین کو ہلا ڈالا۔ کون سی شے درختوں اور پانی کو کھا گئی۔ اتنے خوش نما پیارے پیارے رنگ اور ایسے آب دار جواہرات کس نے برباد کر دیے؟

میروت غم سے بھری ہوئی آواز میں بولی: "میں نے تم کو گردابوں کے کھولنے سے منع نہیں کیا تھا؟ ابا جان نے کالے پرندے کی اطاعت کرنے سے تم کو نہیں روکا تھا؟"

نجمی زمین پر خاک میں لوٹتے ہوئے بولا: "بے شک مجھ سے قصور ہوا ہے۔ میں نے جرم کیا ہے۔ کیا یہ سب بلا اسی کالے پرندے کی نازل کی ہوئی ہے؟"

میروت نے کہا: "ہاں، یہ کالے پرندے کے کرتوت ہیں۔ اس نے بوتل سے جن کو رہا کر دیا، یہ بڑا خوف ناک جن تھا جسے حضرت سلیمان نے قید کر دیا تھا۔"

نجمی مایوسی کی حالت میں چلا کر بولا: "بس! میں موت کا مستحق ہوں۔ مجھ پر ترس نہ کھاؤ۔ مجھے زندگی کی قید سے آزاد کر دو۔ اپنے کسی خادم کو حکم دو کہ وہ میرا خاتمہ کر دے۔"

میروت نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "اٹھو! اے دکھیا بھائی! ناامیدی سے کیا فائدہ، رونے سے ہمیں کیا مل جائے گا؟ تم سمجھتے ہو کہ تم قتل کے مستحق ہو؟ نہیں، بلکہ رحم کے حق دار ہو میرے بھائی! ایسی کون سی عدالت ہوگی جو ان دہشت کے ماروں کو سزا دینا پسند کرے گی۔ ہم اپنی سرزمین پر قتل نہیں کرتے۔ زندگی اتنی پاکیزہ ہے کہ اسے عذاب کا لقمہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر انسان اس ایجاد کی قدر و قیمت جانتا ہو جو اس کائنات میں کام کر رہی ہے تو ایک مچھر مارنے کی جرأت بھی نہ کرے۔ اٹھو اے بھائی! میں تمھارا غم دور کرنا چاہتی ہوں۔"

نجم الدین گر کر اٹھا اور چلا۔ اس وقت اس کا سر گردن سے لٹکا جاتا تھا۔ چاند کی روشنی اس کی آنکھوں پر تاریک نظر آ رہی تھی۔ میروت نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہاں بیٹھ جاؤ اور جو واقعہ ہوا بیان کرو۔" نجمی نے جو کچھ گیا تھا بیان کیا اور جو خوف ناک دھماکا ہوا اور اس کے بعد سمندر کی سطح پر جو شعلہ پھیلا ہوا دیکھا، اس کا حال کہا۔ پھر کہا: "جب میں نے پانی کی سطح پر اس شعلے کو نکلتے دیکھا تو مجھے یاد آیا کہ تم پانی کے نیچے ٹھہری ہوئی ہو۔ اس وقت مجھے زمین اپنے پیروں تلے سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر مجھے کچھ نہ معلوم ہوا کہ کیا واقعہ ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے تمھیں اچانک اپنے سر پر خوش بو نکالتے ہوئے دیکھا۔"

میروت نے ایک آہ بھری اور کہا: "قسمت میں یوں ہی لکھا تھا کہ بادشاہ 'شروِل' کو تمھارے ہاتھ

پر فتح نصیب ہو۔"

نجم الدین نے چلا کر کہا: "شروِل!"

میروت سر ہلا کر بولی: "ہاں بادلوں کے پہاڑ کا بادشاہ شروِل۔ وہ ایک زمانۂ دراز سے قوم سفروت پر گھات لگائے ہوئے تھا۔ کتنے ہی جاسوس بھیج چکا تھا۔ کتنی مرتبہ خود چکر لگا چکا تھا کہ خزانۂ سلیمان سے سرکش جن کی بوتل اڑا لائے۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک وہ اس زبردست بوتل کو چرانے میں کامیاب نہ ہوگا، قوم سفروت سے جیت نہ سکے گا۔ اگر تقدیر نے یہ حکم نہ لگایا ہوتا تو اسے اس کام پر قابو نہ ملتا اور تم تو دکھیا بھائی صرف تقدیر کا حکم جاری کرنے کا ایک وسیلہ بن گئے۔"

نجمی غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا: "انتقام۔ انتقام بہت ضروری ہے۔"

میروت نے سکون کے ساتھ کہا: "یہ ناممکن ہے۔ انتقام سے کیا فائدہ ہوگا؟ اس سے تو برائیاں اور بڑھ جائیں گی۔"

نجمی غصے ہو کر بولا: "کیا یہ جتنی بلائیں نازل ہوئیں ان سے تمھیں غصہ نہیں آتا۔ کیا یہ بربادی تمھارے انتقام کی آگ نہیں بھڑکاتی؟ کیا خزانے اور بوتلیں نہیں ہیں؟"

میروت نے تیوری پر بل ڈال کر کہا: "بلاؤں سے بچانے کے لیے اللہ کافی ہے۔ وہ اپنا فضل کر چکا ہے۔ اب ہم دوسرے جنوں کو بوتلوں کی قید سے آزاد کرنا نہیں چاہتے۔ جب کوئی سرکش جن رہا ہوتا ہے تو ایک ہی زمین کو نہیں خراب کرتا، بلکہ تمام زمینوں پر تباہی پھیلا دیتا ہے۔ اس جزیرے کو برباد کرنے کے بعد وہی سرکش جن خود شروِل کے علاقے پر بھی ٹوٹ پڑے گا۔ پھر بادلوں کے پہاڑ اور اس کے بعد دوسرے پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں پر آفتیں ڈھائے گا اور جب تک قدیم بوتل میں پھر قید نہ ہوگا، یہی تباہیاں پھیلاتا رہے گا۔"

نجم الدین چلا کر بول اٹھا: "کیا یہ ممکن ہے کہ وہ پھر اس قدیم بوتل میں لوٹ آئے؟"

میروت نے شک کے انداز سے سر ہلا کر کہا: "شریروں کے لیے تو یہ بات مشکل ہی ہے کہ وہ ایسے زبردست جن پر قابو پا سکیں۔ ہاں جو لوگ نیک ہیں، اللہ ان کی ہمیشہ مدد فرمایا کرتا ہے۔"

نجمی کو اور سوال کرنے کا موقع نہ ملا۔ آسمان شمال کی طرف سے یک بیک روشن ہو گیا۔ ایک خوف ناک چیخ پکار سے کان کے پردے پھٹتے معلوم ہوئے۔ اس کے بعد ہی نہایت زوردار دھماکا ہوا۔ زمین بری طرح ہلنے لگی اور ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا پیٹ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اس وقت نجمی کو پہلا واقعہ یاد آیا اور وہ ڈر کر چلا اٹھا۔

"کیا وہی خبیث جن پھر پلٹ پڑا ہے؟"

میروت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شمالی پہاڑ کے دامن کی طرف چڑیا کی طرح اچھلتی کودتی جانے لگی۔ نجمی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اسے اس خوف ناک پریشانی میں اکیلا رہ جانے سے ڈر لگا اور وہ بھی میروت کے پیچھے پیچھے دوڑتا شمال کی طرف بڑھنے لگا۔

سلامتی اور محبت کے کبوتر

میروت پہاڑ کے شمالی دامن میں پہنچ گئی۔ نجم الدین بھی جلتی جھلسی چٹانوں پر دوڑتا اور گرتا سنبھلتا بڑھتا رہا۔ جب ٹیلے کے آخری حصے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ میروت اس جگہ سے دور کھڑی ہوئی ہے اور سلوروت قوم کی ایک جماعت اس کے پاس جمع ہے۔ نجمی میروت کی طرف رخ کر کے دریا کے قریبی کنارے تک پہنچ گیا اور یہ سوچنے لگا کہ وہ ایسی عزیز بہن کے کس طرح کام آ سکتا ہے جس نے اس پر عنایتوں اور مہربانیوں کی انتہا کر دی ہے۔ اب اس نے اپنے آپ کو اس بات پر تیار پایا کہ وہ بہن کو بچانے کے لیے اپنی جان تک فدا کر دے گا اور جو خطرے جزیرے پر منڈلا رہے ہیں، میروت کو ان سے محفوظ رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑے گا۔

زمین اب بھی ہلے جا رہی تھی۔ دھماکوں پر دھماکے ہو رہے تھے۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ شعلے کا ایک بڑا ستون اوپر کی طرف آسمان کے سرے کو چھوتا نظر آتا ہے اور اس کا نچلا حصہ سمندر کی سطح کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ پانی اس کی حرارت سے کھول رہا ہے اور اس سے بہت زور کی آواز نکل رہی ہے۔

شعلے کا بالائی حصہ بجلی کی طرح کوند رہا تھا اور اتنا خوف ناک نظر آتا تھا کہ نجمی اس کی طرف آنکھیں نہ کھول سکتا تھا۔ حکیم ارمنا اور اس کے ساتھی عاجزی اور انکسار کے مضمون کے عجیب گیت بڑی درد ناک آواز میں گا رہے تھے۔ ان کے گانوں کی آواز قرآن پڑھنے والے خوش الحان قاریوں سے بہت ملتی جلتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد نجمی نے دیکھا کہ دو گول گول کبوتر فضا میں لٹک رہے ہیں۔ وہ شعلے کے ستون کی چوٹی کے قریب جاتے ہیں اور بڑی احتیاط کے ساتھ پھڑ پھڑاتے ہیں۔ پھر اس سے دور ہٹ کر فضا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر پلٹ کر احتیاط سے شعلے کے گرد پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ اب جو نجمی نے غور سے دیکھا تو وہ آتشیں ستون آہستہ آہستہ گھٹ رہا تھا۔ اس کی روشنی دھیمی پڑ رہی تھی اور اب اس کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھ سکتی تھی۔ وہ دونوں کبوتر جیسے جیسے ستون کی چمک کم ہوتی جاتی

تھی، اس سے اور قریب ہوتے جاتے تھے اور اس پر اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے جیسے اسے اپنے پروں سے بجھا دینا چاہتے ہوں۔

نجمی نے یہ بھی دیکھا کہ وہ ستون کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ کے سامنے پریشان ہوا جاتا تھا اور وہ رو کر اس انداز سے نیچا ہوا جاتا تھا جیسے وہ ان دونوں سے ڈر رہا ہو۔ کبوتر کبھی شعلے کی چوٹی پر پھڑ پھڑاتے جاتے تھے، کبھی فضا میں لٹکے رہتے تھے۔ ستون دھیرے دھیرے بجھتا جا رہا تھا۔ آخر وہ ایک معمولی شعلے کے برابر نظر آنے لگا۔

نجمی اس عجیب و غریب منظر کی طرف مڑا ہوا غور سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ یکایک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہو۔ پیچھے کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ میروت مسکراتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی ہے اور آہستہ آہستہ کہہ رہی ہے، "دیکھ رہے ہو تم؟"

نجمی بول اٹھا، "عجیب چیز ہے۔ یہ میں نہیں جانتا کیا ہے؟"

میروت نے خوش ہو کر کہا، "وہ شیطان ہے۔"

نجم الدین حیرت سے چلّا کر بولا، "کیا سچ مچ وہی ہے!"

میروت نے جواب دیا، "ہاں وہی ہے۔ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم اسے بوتل میں داخل ہوتے دیکھو گے۔ پھر جب تک اللہ چاہے گا، یہ اسی قید میں رہے گا!"

نجم الدین نے پوچھا، "اور یہ دونوں کبوتر؟ کیا شیطان انھیں جلا نہیں سکتا؟"

میروت ہنسی اور اپنی عادت کے مطابق بولی، "یہ ناممکن ہے۔ وہ دونوں سلامتی اور محبت کے کبوتر ہیں!"

نجمی اس کی بات نہ سمجھا پھر بھی اس نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ اس لیے کہ اس وقت وہ شیطان کے دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شیطان بوتل میں کیسے داخل ہوتا ہے۔

اب آتشیں ستون گھٹتے گھٹتے ایک چھوٹے سے چراغ کے برابر رہ گیا تھا۔ پھر نجمی نے دونوں کبوتروں کو سمندر کی سطح پر اترتے دیکھا۔ وہ اس آگ پر جو اب بھی ذرا سی باقی تھی، بڑی شدت سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی اس حرکت سے شعلہ یکایک بجھ گیا۔

جیسے بچے اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوتے ہیں، اسی طرح میروت دونوں ہاتھ سے تالیاں بجاتے ہوئے بولی، "الحمدللہ الحمدللہ!"

نجم الدین بھی دل کی گہرائی سے بولا، "الحمدللہ!"

ٹھیک اسی وقت مقدس شعلے کے پجاریوں کے گیت فضا میں گونجنے لگے۔ ہر طرف سے رسیلے گانوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور نجمی کو ایسا معلوم ہوا جیسے پتھر بھی ان گیتوں میں آواز ملا رہے ہوں۔ میروت بھی سب کے ساتھ اپنی پیاری آواز سے گانے میں مشغول تھی۔

اس وقت نجم الدین خوشی سے باغ باغ ہو رہا تھا۔ اب جرم کے احساس کا جو بوجھ اس کے دل پر تھا، وہ بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ اتنے میں دونوں کبوتر اپنی چونچوں سے ایک بوتل پکڑے ہوئے ہوا میں نظر آئے۔

نجمی جوش سے بولا، "دیکھ رہی ہو بہن!"

میروت نے کہا، "ہاں، وہ اس بوتل کو میرے ابا جان کے پاس لے جا رہے ہیں۔"

عین اسی وقت نجمی کی نظر شاہ سوریو پر پڑی جو پہاڑ کے دامن میں سر پر تاج رکھے ہوئے ایک چٹان پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ نجمی کے منہ سے بے اختیار نکلا، "بادشاہ سلامت یہاں ہیں!"

اور وہ تیزی سے ایک چٹان کے سائے میں ہو لیا تاکہ اس پر بادشاہ کی نظر نہ پڑے۔ ادھر وہ

دونوں کبوتر فضا میں بلند ہو کر جزیرے کے آسمان پر پرواز کرنے لگے۔ اب ان کی یہ حالت تھی کہ کبھی غاروں کے اندر داخل ہو جاتے اور کبھی نگاہوں سے اوجھل ہو کر وادیوں اور پہاڑیوں میں جا گھستے۔ پھر پلٹ کر زمین کی سطح کے قریب اڑنے لگتے۔ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ بازوؤں سے چٹانوں کو چھو کر آ رہے ہیں۔ کبوتر جس وقت نجمی کے قریب سے گزرتے تو ان کے منہ سے ایسی رس بھری آواز نکلتی جیسے بلبلیں چہچہا رہی ہوں۔ نجمی یہ آواز سن کر دل میں کہتا: "اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ آسمان کے فرشتے ہیں!"

کبوتر اپنے الٹے چکروں کے درمیان ایک موقع پر نجم الدین کے اتنے قریب آ گئے کہ ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ رہا۔ یہ دیکھ کر نجمی کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ زمین کی سطح یکایک بدل گئی تھی اور پھر پہلی سی حالت پر آ گئی تھی۔ چٹانیں پھر سے گلابی یا ارغوانی رنگ کی ہو گئیں یا کہربا کی طرح زرد نظر آنے لگیں۔ اس علاقے کی گھاس پھوس اور پھول پلک جھپکنے میں پھر تر و تازہ اور جان دار بن گئے۔ اس نے اپنے قریب چشمہ دیکھا جس میں صاف شفاف پانی اچھل رہا تھا۔ نجمی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور اس نے آگے بڑھ کر پانی کو چکھ کر دیکھا تو اسے پہلے کی طرح میٹھا اور فرحت بخش پایا۔

نجمی کے دل میں ناامیدی کے بجائے امید گھر کر رہی تھی اور وہ پھر اسی جزیرے میں رہنے کی زبردست خواہش محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بس گیا تھا کہ وہ یہ جزیرہ چھوڑ کر نہ جا سکے گا اور نہ کسی اور جگہ رہ سکے گا۔ اس نے جی میں یہ فیصلہ کیا کہ میروت سے کہہ کر بادشاہ سے اپنی خطا معاف کرا لے تاکہ جزیرے میں رہنے کی جرأت کر سکے۔

نجمی میروت کو جس جگہ چھوڑ کر گیا تھا، دوبارہ وہیں پہنچا، مگر میروت یہاں نہ ملی۔ اس لیے تعجب سے آس پاس مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کوشش سے نجمی کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے لڑکی آسمان پر پرواز کر گئی یا زمین کے اندر کہیں گھس گئی۔ پریشان ہو کر ادھر ادھر ڈھونڈنے اور میروت کا نام لے کر پکارنے لگا۔ ابھی آواز بازگشت کے سوا کوئی صدا نہ سنی۔ سیر کے درمیان نجمی یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ سارے جزیرے کی سطح پھولوں، درختوں، پرندوں اور طرح طرح کے رنگوں میں جیسی پہلے تھی، ویسی ہی اب بھی نظر آ رہی ہے۔ اگرچہ اس میں آگ لگ چکی تھی اور ہر طرف بربادی کی وجہ سے ساری رونق ختم ہو چکی تھی۔ اب اس ویرانی اور بربادی کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔

نجم الدین اسی طرح سیر کرتے کرتے جھیل کی طرف جا پہنچا۔ یہاں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس کے سنگ ریزے چاند کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہے تھے، لیکن میروت کی نگاہوں سے اوجھل ہونے

کی وجہ سے نجمی کو سیر میں کوئی لطف نہیں آ رہا تھا اور وہ بدحواس لوگوں کی طرح بلند آواز سے "میروت میروت" پکارتے جا رہا تھا۔ مگر جب نجمی یہ محسوس کرتا کہ اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں، وہ جو کچھ کہتا ہے وہی آواز پلٹ کر اس کے کانوں میں آجاتی ہے تو اس کا دل غم سے نڈھال ہونے لگتا۔

آخر اس نے پہاڑ کے دامن کا رخ کیا اور محل کی طرف چڑھنے کا ارادہ کیا کہ شاید میروت وہاں موجود ہو۔ مگر جیسے ہی اس نے اس سمت میں ایک قدم بڑھایا، اسے اپنے سامنے ایک شخص کھڑا نظر آیا جس کی شکل حکیم ارسطاطاحب سے مشابہ تھی۔ بس اتنا فرق تھا کہ اس کی داڑھی زرد رنگ کی تھی اور وہ اپنے ہاتھ میں تلوار سے ملتا جلتا کوئی چھوٹا ہتھیار پکڑے ہوئے تھا۔

نجمی نے اس سے میروت کو پوچھا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ اپنا ہتھیار بلند کر کے زور سے کہا،

"لوٹ جاؤ جہاں سے آئے ہو۔"

نجم الدین گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا دل غصے کی وجہ سے زور زور سے اچھل رہا تھا۔ اس لیے کہ قوم سقروت کے لوگوں میں سے کبھی کوئی اس سے اتنی بے دردی کے ساتھ پیش نہ آیا تھا۔ اس قسم کے سلوک کا یہ پہلا موقع تھا۔ پھر بھی اس نے ضبط سے کام لیا اور کہا،

"کیا میروت میری بہن نہیں ہے؟"

اس شخص نے پھر اپنا ہاتھ اٹھایا اور کہا، "یہ میرے آقا حضور بادشاہ سلامت کا حکم ہے۔"

نجمی پیچھے کی طرف مڑا۔ اس ناگہانی برتاؤ سے اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس کا بدن پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ اس کا غصہ بھڑک اٹھا اور اس نے چیخ کر کہا، "تم نے جھوٹ کہا۔ حضور بادشاہ سلامت میرے نکالے جانے کا حکم نہ دیں گے۔ میں میروت کا بھائی نجم الدین ہوں۔"

یہ کہہ کر نجمی نے پہاڑ پر چڑھنے کا ارادہ کیا، لیکن اس شخص نے تلوار والا ہاتھ اس کے چہرے کے آگے اٹھا دیا۔ اس وقت نجمی کو اپنے بدن میں سخت کپکپی محسوس ہوئی تھی اس لیے وہ اپنی جگہ ٹھہر گیا اور اس شخص کی طرف ہاتھ جھکا کر التجا کرنے لگا کہ مجھے اجازت دو کہ میں اپنی بہن کو دیکھ لوں، مگر اس شخص کا جواب ہر مرتبہ یہی تھا، "جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔"

اب جو نجمی نے سامنے دیکھا تو ایک ہوائی غالیچہ نظر آیا جو زمین پر بچھا ہوا تھا۔ اس شخص نے قالین کی طرف اشارہ کر کے کہا، "جہاں پناہ نے حکم دیا ہے کہ میں تمھارے لیے یہ غالیچہ تیار کر دوں، تاکہ یہ تمھیں بغداد پہنچا دے۔"

نجم الدین سر جھکا کر سوچنے لگا کہ کیا کہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ وہ اپنے

دل میں کہہ رہا تھا کیا میں اسی حالت میں اپنے وطن کو لوٹ جاؤں؟"

اس شخص نے جیسے اس کے دل کی بات جان لی۔ وہ اس سے بولا، "کیا تم تھوڑے سنگریزے ساتھ لے جانا نہیں چاہتے؟"

نجمی دل میں بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس شخص نے یہ بات مذاق اڑانے کے لیے کہی تھی۔ اس نے ذرا اکڑ کے کہا، "میں تو صرف میروت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس شخص نے جواب دیا، "تو بس قالین پر سوار ہو جاؤ اور چلے جاؤ۔"

نجمی حیران پریشان اسے دیکھ رہا تھا اور ایک بار پھر اس فکر میں پڑ گیا تھا کہ کیا بغداد لوٹ جاؤں تو اسی حالت میں مارا کھدیڑا ہوا گھر پہنچوں؟ ایسی ایسی مصیبتیں اور صدمے اٹھانے کے بعد بھی خالی ہاتھ چلا جاؤں؟ اور کیا اتنے آرام سے رہنے کی عادت پڑنے کے بعد بھی مفلسی اور فاقہ کشی کی زندگی مجھ سے گزاری جا سکے گی؟

اسی سوچ میں اس نے اپنا سر اٹھایا اور کہا، "جب میرا جانا ہی ضروری ٹھہرا تو مجھے ایسی کوئی چیز ضرور لے جانا چاہیے جو مجھے میروت کی یاد دلاتی رہے۔"

وہ شخص مسکراتے ہوئے بولا، "یہ سنگ ریزے جتنے لے جانا چاہو لے لو۔"

اس عجیب شخص کی بات میں حقارت کا جو انداز چھپا ہوا تھا، اسے محسوس کر کے نجمی کو غصہ آنے ہی والا تھا اور قریب تھا کہ وہ کچھ لے جانے سے انکار کر دے، مگر پھر اسے خیال آیا کہ جزیرے سے یہ ایک آخری موقع مل رہا ہے۔ اس کے بعد امید نہیں کہ پھر یہاں آنا ہو سکے۔ وہ غصہ پی گیا اور خاموشی سے جھیل کی طرف چلا گیا، تاکہ وہاں سے جتنے جواہرات لے جا سکتا ہو، جمع کر لے۔

جب وہ ضرورت بھر چیزیں جمع کر چکا تو اس نے انھیں قالین پر پھیلا دیا اور اس شخص سے کہا، "میں یہ آلات بھی ساتھ رکھ لوں۔ یہ میری بہن نے مجھے تحفے میں دیے ہیں؟"

"ہاں تم چاہو تو یہ تمھارے ہی ہیں۔" وہ شخص بولا۔

نجمی نے وہ آلات بھی اکٹھے کر لیے اور انھیں قالین پر رکھ کر کہا، "ایک تانبے کی بوتل بھی رکھ لوں؟"

اب تو وہ شخص سختی سے چلا اٹھا اور کہا، "بے ہودہ پن کی حد ہو چکی۔ اے انسان، بس کر۔"

نجم الدین اتنے سخت لہجے کا عادی نہ تھا۔ اسے یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے چاہا کہ کہہ دے کہ ایک سخت بات ہی کہہ کر اس سے بدلا لے۔ اس نے کہا، "کیا تمھیں اس کا اطمینان ہے کہ جیسے سخت لہجے میں تم مجھ سے بات کر سکتے ہو، میں تم سے نہیں کر سکتا؟"

اس شخص نے زمین پر گر کر کہا، "معاف کیجیے جناب، میرا ارادہ آپ کو گالی دینے کا نہ تھا۔ اصل میں آپ نے بوتل کا ڈاٹ کھول کر مجھے باہر نکال دیا، مگر آپ بھی معذور ہیں، آپ یہ نہیں جانتے کہ ایک زبردست جن کو بوتل سے آزاد کرنا تو آسان ہے، مگر یہ نہیں سمجھتے کہ وہ کتنی تباہی پھیلا دیتا ہے۔ پھر یہ بھی آپ کے بس کی بات نہیں کہ اس کو پھر اسی بوتل میں قید کر سکیں۔ اگر وہ ایک بار رہا ہو جائے تو قریب قریب پوری زمین کو برباد کر سکتا ہے اور آخر میں اسی شخص کو بھی ہلاک کر سکتا ہے جس نے اسے بوتل سے رہا کیا تھا۔"

نجمی بگڑ کر بولا، "تو میں ان دونوں کبوتروں کو بوتل میں کیوں نہ لے جاؤں کہ وہ اس جن سے نمٹ لیں۔"

اس نے کہا، "وہ انسان کا ساتھ نہیں دیتے۔"

نجمی نے کہا، "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان کی حفاظت کروں گا۔" اس شخص کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا، "نوجوان، تم وعدہ تو بڑی جلدی کر لیتے ہو، مگر تمھیں جب بھوک لگے گی، انھیں ذبح کر ڈالو گے۔"

اب قالین پر سوار ہونے کے سوا کوئی حیلہ باقی نہ رہا تھا۔ پھر بھی اسے اپنا وہ خط یاد آ گیا جو اس نے میرونت کو لکھا تھا۔ تھوڑی تلاش کے بعد یہ خط اسے جیب کی تہ میں مل گیا۔ اس نے وہ خط اس شخص کی طرف بڑھایا اور کہا، "کیا مہربانی کر کے اسے میرونت تک پہنچا دو گے؟ اسے میں نے اپنے خون سے لکھا ہے۔"

نجم الدین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ شخص اس پر مہربان ہو گیا۔ اس نے خط نجمی سے لے لیا۔ پھر قالین کے پھندنے زور سے کھینچے اور کہا، "اسے بغداد پہنچا دو۔"

یہ سنتے ہی قالیچہ ہوا پر تیرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ زمین چھوٹی نظر آنے لگی اور جزیرہ نجمی کو بالکل ہتھیلی کے برابر معلوم ہونے لگا۔ اب قالیچہ تیزی سے پہاڑوں اور دریاؤں پر سے اڑتا جا رہا تھا اور وہ اس کے پھندنے پکڑے ہوئے چین سے سو رہا تھا۔

جب نجمی اپنے وطن پہنچا تو اس نے بہت سی زمینیں اور بڑے بڑے محل خریدے۔ نہایت عمدہ اصیل عربی گھوڑے اپنے اصطبل میں جمع کیے۔ بہت سے غلام اور لونڈیاں گوری اور کالی ہر قسم کی خریدیں اور خلیفہ بغداد کے بعد وہاں کا سب سے بڑا آدمی بن گیا۔ پھر اس نے اپنے دوستوں کو تلاش کیا اور انھیں بہت سا مال و دولت دے کر دولت مند بنا دیا۔ اس نے اپنی خالہ کا بھی بہت خیال رکھا اور محلہ رصافہ میں دجلہ کے کنارے ایک شان دار محل باغ میں بنوا دیا۔

یہ سب کچھ تو ہوا، مگر نجم الدین کو حاجی بصری کا کوئی پتا نشان نہ ملا۔ آخر وہ اس کی تلاش سے مایوس ہو کر اور کاموں میں مشغول ہو گیا۔

نجمی کے پاس خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ مال و دولت، شان و شوکت اور عزت کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی وہ دن رات میرونت کو یاد کیا کرتا تھا۔ چاندنی راتوں میں ہمیشہ معشوق کان کے پاس جا بیٹھتا، تاکہ اس کی آواز سن کر دل بہلائے اور میرونت بھی نیلی جھیل کے قریب اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہ گیت گاتی ہوتی:

اے چناروں کے پھول
کہیں جانا نہ بھول

پیارا موسم ہے یہ
نیارا موسم ہے یہ
تو ہے جانِ بہار
تجھ سے اس کا نکھار
آہا آہا آہا
آہا آہا آہا

چالاک خرگوش کے کارنامے

(ناول)

معراج

جنگل میں لومڑی سے زیادہ چالاک، ریچھ سے زیادہ خطرناک، بھیڑیے سے زیادہ خوں خوار اور شیر سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہوتا، لیکن ایک چالاک خرگوش نے بلی سے لومڑی کی پٹائی کرائی ریچھ کو کنویں میں جا پھنسایا، بھیڑیے کو درخت کی کھوہ میں بند کیا اور شیر کو درخت سے باندھ دیا۔ اس چھوٹے سے جانور نے چالاکی سے کس کس طرح تمام جانوروں کو بے وقوف بنا کر ناکوں چنے چبوائے۔

یہ دلچسپ باتیں آپ اس ناول میں پڑھیے۔

مکتبہ پیام تعلیم کی ایک نہایت دلچسپ کتاب

حاجی بابا

صاحب طرز ادیب جناب ... انصاری کے قلم سے

قیمت: 6/00

ننھا سُراغ رساں

بچے اور نوجوان بھی بہادری اور سُراغ رسانی کے کام کر سکتے ہیں۔ سراغ رسانی اور بہادرانہ کارناموں کی یہ بچے کہانیاں پڑھیے۔ ان میں:۔

★ ایک ننھا سُراغ رساں ایک تلوار پر کھدی ہوئی عبارت پڑھ کر دلیل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ تلوار کبھی امریکی جنرل جیکسن کے پاس نہیں رہی تھی۔ ★ جرمنی میں قیدی لکڑی کے گھوڑے کے نیچے زمین میں سرنگ بنا کر فرار ہو جاتے ہیں ★ ایک سرکس میں لکڑی کے شیر کے پیٹ میں چھپائے ہوئے جواہرات کا کھوج لگاتا ہے۔ ★ اس کے علاوہ جواہرات پر ڈاکا ڈالنے کے لیے ہوائی جہاز کو ہائی جیک (اغوا) کرنے کا سنسنی خیز واقعہ پڑھیے۔

ننھا سیاح

ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی

(کہانیاں)

علی اسد

انگلستان کے نامور وزیر اعظم چرچل ایک کہانی بڑے مزے سے پڑھا کرتے تھے۔ جانتے ہو وہ کہانی کون سی ہے؟ ایک بہادر لڑکے کی آپ بیتی یعنی ار ایل اسٹیونسن کی کتاب **دی ٹریژر آئی لینڈ۔ جو انگریزی ادب کا ایک** شاہکار ہے۔ آپ بھی یہ کہانی اس کتاب میں پڑھیے اسی مصنف کی دوسری مشہور کہانی **اغوا** بھی پڑھ کر لطف اٹھایئے۔

پُرخطر زندگی کے بارے میں ایک اور مقبول کہانی "ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی" بھی دی گئی ہے۔ اسے فریڈرک میریٹ نے لکھا تھا۔

اس کے علاوہ ہمت و جرات کی بے مثال کہانی "ڈڈ کورٹی کا ایڈیٹر" بھی پڑھیے جس میں ایک اخبار کا ایڈیٹر جان کے خطرے کے باوجود سچ باتیں لکھتا رہا۔ اس کی بے خوفی کی وجہ سے ایک بدنام ڈاکو کی گرفتاری عمل میں آئی۔ مشہور مترجم علی اسد نے ان کہانیوں کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔

بچوں کا پرانا ساتھی

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

۱۹۲۶ء سے شائع ہو رہا ہے

- دلچسپ، حیرت انگیز اور پُراسرار کہانیاں
- سائنس اور مذہبی معلومات
- کارٹون، لطیفے اور مزاحیہ مضامین
- تاریخ، جغرافیہ
- شہریت کے آداب

پُر دلچسپ انداز میں
بہترین مواد پیش کرتا ہے۔

ماہنامہ پیام تعلیم

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵